سفرنامہ
جس دیش میں گنگا بہتی ہے
امجد اسلام امجد
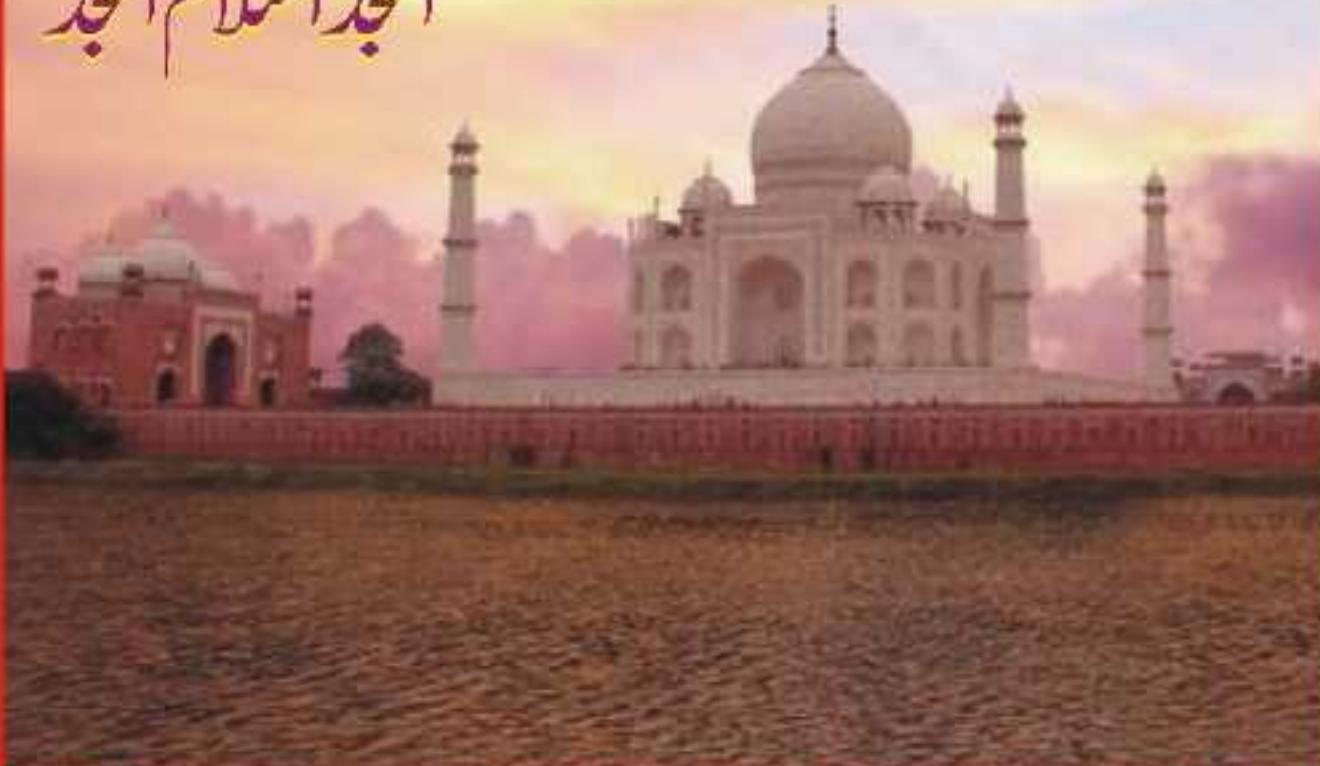
جس دیش میں گنگا بہتی ہے

سفرنامہ

امجد اسلام امجد

جس دیش میں گنگا بہتی ہے

کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل ہزاروں میل دور سمندر پار بسنے والی قوموں کے بارے میں جتنا کچھ جانتی ہے اس کا عشر عشیر بھی اسے چند میل کے فاصلے پر بسنے والے ان لوگوں میں بارے میں معلوم نہیں جن کے ساتھ ان کی مشترکہ تہذیب اور تاریخ کی داستان کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اگر اس صورت حال کو آج پر منطبق کیا جائے تو اگرچہ پاکستان کا قیام ناگزیر تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بٹوارے سے پہلے ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ بھی گزارہ تھا اور اس سے کی اگر کچھ ناگواریاں تھیں تو کچھ خوشگوار احساسات بھی تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صحن اور باورچی خانے کی تقسیم کے بعد ہم لوگ زیادہ اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے کہ یہ تقسیم جھگڑا نہیں بلکہ جھگڑے کا حل تھی۔ مگر بدقسمتی سے ان باسٹھ برسوں میں دونوں ملکوں کے عوام نے فیصلے کا اختیار اپنے اپنے سیاست دانوں کو دے دیا اور وہ ہمیں ایک دوسرے سے دور کرتے چلے گئے۔ فسادات میں جو کچھ ہوا وہ دیوانگی کے ایک فوری ردعمل کی داستان تھی یا یہ بارودی سرنگیں ہمارے اجتماعی ماضی کے راستوں میں پہلے سے دبی ہوئی تھیں۔ اس پر ایک بے نتیجہ گفتگو آئندہ کسی صدیوں تک ہو سکتی ہے مگر ہمارے نزدیک اس کا ایک انتہائی اہم پہلو انگریز حکمرانوں کی ''Divide and Rule'' (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کی پالیسی یقیناً تھی جس نے صدیوں پر محیط ایک جڑے ہوئے معاشرے کے منفی عناصر کو اتنی ہوا دی کہ ایک معقول سطح کا Intimate Relationship ایسا بگڑا کہ ہم لوگ اسے ایک Working Relationship کی شکل میں برقرار نہ رکھ سکے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے کہ دونوں طرف سے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ''سر کن کے پھوٹ رہے ہیں'' کچھ ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا کہ پاک بھارت تعلقات (کم از کم عوام کی حد تک) میں یہ حالیہ گرم جوشی

امریکہ کی تابعداری کا نتیجہ ہے۔ میڈیا کی آزادی کی وجہ سے ایک دوسرے کے بارے میں معلومات کی فراوانی کے باعث ہے یا سچ مچ دونوں ملکوں کے لیڈروں نے اس صورت حال کی روز افزوں سنگینی کا اندازہ کرلیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تینوں ہی عناصر اس تبدیلی کا باعث بنے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے کچھ ایسے اسباب بھی ہوں جو ابھی تک واضح اور روشن نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک یہ ایک مستحسن صورت حال ہے جسے محاورتاً ''دیر آید درست آید'' بھی کہا جاسکتا ہے وہ لوگ جو اسے شک وشبے کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ خوشی منانے یا لڈیاں ڈالنے سے منع کررہے ہیں انہیں بھی اس کا حق ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے اور ماضی کے بہت سے تجربات بھی ان کے حق میں جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے ایک سابقہ کھلاڑی ہونے کے ناتے سے یہی ہے کہ ہر بال کو اس کے میرٹ پر کھیلنا چاہیے سو ہمیں مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ یہ منافقت سے پاک ہوگی۔

گزشتہ برس بھارت میں سات دن گزارنے کا تجربہ بہت خوشگوار تھا کہ حکومت اور عوام دونوں سطحوں پر محبت کے دعوے اور اظہار ہو رہا تھا۔ اس بار اگرچہ بھارت کی حکومت بدلی ہوئی تھی اور اس کی پاک بھارت پالیسی میں بھی وہ گرم جوشی نہیں رہی جو پہلے تھی لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کے باوجود عوام سے عوام کے رابطوں اور باہمی تعلقات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور بقول شخصے یہ وہ جن ہے جو بوتل سے باہر آگیا ہے اور اب اسے واپس بوتل میں ڈالنا خود اس کے آقاؤں کے بس میں بھی نہیں رہا۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے دوست اور فلم ادب اور موسیقی کی دنیا سے تعلق رکھنے والے پاکستانی احباب کے جانے پہچانے اور محبوب گلزار صاحب اپنی ادبی گرو اور بابا احمد ندیم قاسمی صاحب کی عیادت کے لیے پاکستان آئے تو ان کے ساتھ ایک زیر تکمیل پاکستانی میوزک البم کے کچھ ویڈیوز بنانے کی بات چلی جس کے پروڈیوسر برادر عزیز یونس چوہدری ہیں جو موسیقی کے عاشق اور دیوانے ہیں اور جو الیکٹرانک سازوں کے بے ہنگم شور' بے سرے گلوکاروں' بے سروپا شاعری اور راگوں کی بنیاد سے آزاد کمپوزیشنز کے اس طوفان میں ساز' آواز اور الفاظ کا ایک ایسا گلدستہ بنانے کے خواہاں ہیں جس کا ہر پھول اصلی اور خوشبودار ہو اور جس کی ساخت اور پرداخت نہ صرف اپنی مٹی میں ہو بلکہ اسے ''کیمیکلز'' سے بھی محفوظ رکھا جائے۔ میرے غریب خانے پر اس وقت تک تیار دو ریکارڈنگز انہیں سنوائی گئیں اور طے پایا کہ گفتگو کا اگلا سیشن ممبئی میں ہوگا جس میں مطلوبہ تفصیلات طے کی جائیں گی۔ ابھی ہم لوگ پروگرام بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ دہلی سے ساہتیہ اکیڈمی والوں کی دعوت آگئی کہ وہ ۱۸ تا ۲۰ مارچ ۲۰۰۵ء ''اردو کی نئی بستیاں'' کے زیر عنوان ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کررہے ہیں اور مجھے اس کے ایک اجلاس کی صدارت کرنا ہوگی۔ اس دعوت نے نہ صرف یہ

مسئلہ حل کر دیا بلکہ میری بیگم کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کا رستہ بھی نکل آیا کہ اسے انڈیا دیکھنے کا بہت شوق تھا سو اس کے لیے بھی دعوت نامہ منگوایا گیا تاکہ ویزے میں سہولت ہو سکے۔ وزارت خارجہ کے احباب برادرم اشرف قریشی اور سلیم عباس گیلانی کی محبت اور توجہ سے بھارتی سفارت خانے کے ویزا سیکشن کی پیدا کی ہوئی کچھ اڑچنیں بروقت دور ہو گئیں اور یوں ہمیں ایک مہینے کا دہلی، آگرہ لکھنو اور ممبئی کے لیے پولیس رپورٹ سے مستثنیٰ ویزا مل گیا۔

یونس صاحب اور ان کے صاحبزادے عزیزی خرم کو ان کے کسی سیاستدان دوست نے ویزا دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ سو طے پایا کہ ہم لوگ اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ۲۲ مارچ کو دہلی میں اکٹھے ہو جائیں گے۔

دوست احباب کو پیش کرنے کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحفے خریدنے نکلے تو ایک لطیفہ بہت یاد آیا، آپ بھی سن لیجیے۔

ایک صاحب پہلی بار کسی دوست کے گھر جا رہے تھے دوست نے بڑی تفصیل سے راستہ اور پتہ سمجھایا اور آخر میں کہا۔ ''دروازے کی بیل دائیں ہاتھ پر لگی ہے اسے کہنی سے دبا دینا۔''

ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہنی سے کیوں۔۔۔۔۔۔۔ ہاتھ سے کیوں نہ بجاؤں گھنٹی؟''

''وہ اس لیے کہ تمہارے دونوں ہاتھ تو تحفوں سے بھرے ہوں گے۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔''

لاہور ائیر پورٹ پر رضا علی عابدی کا متبسم چہرہ ہمارا منتظر تھا ان کی آواز کی طرح ان کی مسکراہٹ بھی بہت خوبصورت ہے۔ رسماً بھی مسکرائیں تو اچھا لگتا ہے اور اب تو برسوں کا تعلق بھی شامل حال تھا میں نے ان سے گلزار جاوید اور ناصر بغدادی کا اتہ پتہ پوچھا اور بولے۔ ''گلزار ابھی نہیں پہنچے اور ناصر بغدادی صاحب کو میں صورت سے پہچانتا نہیں ہوں، ہو سکتا ہے یہیں کہیں ہوں ویسے اب تو اصلی بغدادی کی صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔'' کچھ دیر بعد ناصر بغدادی آئے تو گلزار نے ہم دونوں کے بالوں سے محروم سروں کی طرف غور سے دیکھا اور پھر میرے کان میں آہستہ سے بولا۔ ''آپ دونوں تو ہم زلف نکلے۔''

لاہور سے دہلی تک پرواز کا دورانیہ صرف پچاس منٹ تھا۔ ٹیک آف اور لینڈنگ کے بیچ ایک سینڈوچ بھر وقفہ تھا جو چائے کی پیالی سے پہلے ختم ہو گیا۔ امیگریشن ہال میں پہنچے تو مجھے یاد آیا کہ پچھلی بار انہوں نے پاکستانی مسافروں سے الگ سے ایک فارم (جس کی تین کاپیاں تھیں) بھروایا تھا۔ بڑھتی ہوئی دوستی کے دعووں کے باوجود یہ ''خصوصی سلوک'' ابھی تک جاری تھا بس اتنا فرق پڑا کہ گلزار کے ایک عزیز نے جو ائیر پورٹ سے ہی متعلق تھا ایک کمرے میں بٹھا دیا اور امیگریشن کی ساری کارروائی وہیں پوری کرا دی۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ہدایت تھی کہ ہم ٹیکسی لے کر اپنی معینہ قیام گاہ یعنی انڈین انٹرنیشنل سنٹر پہنچ جائیں کرایہ وہاں ادا کر دیا

جائے لیکن ہمیں وہاں پہنچانے کی ذمہ داری برادرم عازم گروندر کوہلی نے لے رکھی تھی جس سے ملتا جلتا چہرہ اس اس وقت کہیں دور دور تک دکھ نہیں رہا تھا۔

عازم کوہلی سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۲۰۰۴ء تک ایک انتہائی دھند آلود رات کو ہوئی جب وہ اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ ایک ایسی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آیا تھا جس سے متعلق رشتے کئی نسلوں تک پھیلے ہوئے تھے کہ اس کے میزبان گھمن صاحب کی فیملی کے ساتھ اس کے بزرگوں کا دوستانہ بہت پرانا اور گہرا تھا جو قیام پاکستان یا بقول ان کے 'بٹوارے' کے بعد بھی جاری وساری رہا اور دونوں خاندانوں کے افراد ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہے ہیں۔ اس واقعہ سے چند ماہ قبل ای میل پر عازم نے مجھ سے رابطہ کیا میں کمپیوٹر کے حوالے سے ناخواندہ ہوں سو میری میل میرا بیٹا علی ذیشان دیکھتا ہے اور اپنی صوابدید کے مطابق پرنٹ نکال کر مجھے دے دیتا ہے۔ میں ہاتھ سے ان کے جواب لکھ دیتا ہوں جنہیں وہ متعلقہ احباب کو ای میل کر دیتا ہے اور یوں اس کمپیوٹر زدہ دنیا میں گزارے کی ایک شکل نکل آتی ہے۔ بوجوہ یہ ملاقات بہت مختصر تھی کہ چند گھنٹوں بعد عازم کو بذریعہ بس دہلی روانہ ہونا تھا اس وقت تک ابھی دونوں ملکوں کے درمیان پروازوں کا سلسلہ بحال نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس بیگم (ینا بھابی) بھارتی کرکٹر مننددر سنگھ کی بہن ہیں اور خود عازم اردو پنجابی دونوں زبانوں میں صاحب کتاب شاعر ہیں۔ دہلی واپس جا کر اس نے اپنے سفری تاثرات پر مبنی ایک نظم مجھے بھجوائی جس کا عنوان تھا ''کچھ دن ٹھہرو گے لاہور!''

یہی نظم اصل میں ہماری دوستی کا نقطہ آغاز بنی کہ یہ ایک انتہائی خوبصورت' سادہ اور دل کو چھونے والی نظم تھی جو بیانیہ انداز کی ہوتے ہوئے بھی سیاسی بیانات سے کوسوں دور تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میرا ایک مشاعرے کے سلسلے میں بھارت جانا ہوا تو دلی میں میری میزبانی کا حق عازم نے از خود حاصل کر لیا اور یوں اس سے دوستی اور مسلسل رابطے کا ایک ایسا سلسلہ بن گیا کہ اس بار اس نے ہمیں صرف کانفرنس کے تین دنوں کی حد تک ساہتیہ اکیڈمی کا مہمان بننے کی اجازت دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ ائیر پورٹ سے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر پہنچانے کے لیے وہ اور ینا بھابی آئیں گے تاکہ ان کی بھابی یعنی میری بیگم کو بھارت کی سرزمین پر باقاعدہ خوش آمدید اور ''جی آیاں نوں'' کہا جا سکے۔ یہ تفصیل تھی اس اجمال کی کہ ائیرپورٹ پر خلاف توقع وہ لوگ موجود نہیں تھے۔ گلزار جاوید کے عزیز کے موبائل سے انہیں کال کی تو پتہ چلا کہ وہ پون گھنٹے سے ہمارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ گلزار کا بھتیجا پروٹوکول دینے کے جوش میں ہمیں ایک بغلی دروازے سے باہر لے آیا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ خیال آیا کہ شیخ سعدی نے کئی صدیاں قبل ایسی ہی کسی صورت حال میں کہا ہوگا۔

راہ راست بردا گرچہ دوراست

یعنی سیدھے راستے پر چلو چاہے وہ لمبا ہی کیوں نہ ہو۔

گزشتہ برس کی نسبت اس بار دہلی کی سڑکوں پر ٹریفک کی بدنظمی نسبتاً کم تھی۔معلوم ہوا کہ زیرزمین ریلوے سسٹم کا ایک حصہ مکمل ہو کر کام کرنے لگا ہے سو سڑکوں سے ٹریفک کا کچھ لوڈ کم ہو گیا اور اس دوران میں کچھ فلائی اوورز بھی مکمل ہو گئے ہیں جس سے مزید سہولت ہو گئی ہے (اگرچہ بعد کے تجربات مختلف نکلے لیکن ان کا ذکر آگے آئے گا) انڈین انٹرنیشنل سنٹر کہنے کو ہمارے لاہور جم خانہ کی طرح کا ایک کلب ہے لیکن نہ تو وہاں ہماری طرح انگریز کی یادگار یعنی ٹائی لگا کر آنے کا کامپلیکس اور پابندی ہے اور نہ ہی اس کا ممبر بننے کے لیے بہت بھاری بنک اکاؤنٹ کی ضمانت درکار ہوتی ہے۔یہ فنون لطیفہ سے کسی نہ کسی طرح متعلق لوگوں کا کلب ہے اور یہی اس کی اہلیت کی واحد شرط ہے۔ان کے طور طریقے دیکھ کر ایک بار پھر احساس ہوا کہ ان لوگوں نے بعض عمدہ اصول وضع کر کے اور پھر ان پر قائم رہ کر کس طرح ایک ایسا نظام اقدار بنا لیا ہے جس کی بنیاد انسانیت اور ہنرمندی پر ہے۔ہماری طرح انہوں نے جاگیرداری' کالا صاحب اور فوجی بوٹ کو سر پر چڑھانے کے بجائے انہیں ان کی جگہ پر رکھا ہے۔سو اس کلب میں ہمیں یہ تینوں عناصر اور ان کے تازہ وارد ساتھی یعنی نودولتیا کلاس والے بھی نظر نہیں آئے یا کم از کم ایسے لوگ نمایاں نہیں تھے۔جس سے بھی بات کی اسے فنون لطیفہ کے کسی نہ کسی شعبے کی پہلی صف میں پایا۔اکثر لطیفے اپنی بنیاد میں بڑے دردناک ہوتے ہیں۔ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت یاد آ رہا ہے۔آپ بھی اس زہرخند میں شامل ہو جائیے۔

سینئر شاعر شہزاد احمد راوی ہیں کہ ایک بار رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہو رہے تھے' اس وقت کی برسراقتدار پارٹی نے اپنا ووٹ بنک بڑھانے کے لیے اپنے من پسند آدمیوں اور غیر ادیب دوستوں کو بطور ادیب ممبرشپ دے دی اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب ان کے نام پڑھے تو حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کون سے ادیب اور شاعر ہیں' میں تو ان میں سے بیشتر ناموں سے بھی واقف نہیں۔اس پر شہزاد احمد نے کہا۔

''آپ خاطر جمع رکھئے ان میں سے بھی اکثر آپ کا نام نہیں جانتے۔''

بات کسی اور طرف نکل گئی خیر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں کیونکہ وطن عزیز میں اکثر باتیں کسی اور طرف نکل جاتی ہیں۔کمرہ نمبر ۶۰ میں سامان رکھا اور ساہتیہ اکیڈمی کے افسر مہمانداری سے آئندہ پروگرام کی تفصیلات حاصل کیں معلوم ہوا کہ بیشتر مندوب آ چکے ہیں اور کچھ رستے میں ہیں لیکن آج کی شام اور رات کا کوئی خاص طے شدہ پروگرام نہیں۔ڈنر کا انتظام یہیں ہے باقی آپ جہاں چاہیں'

آ ئیں جائیں۔ عازم اور بھابی کا اصرار تھا کہ آئندہ تین دن آپ نے ہمارے ہمارے قابو نہیں آنا اس لیے اس وقت ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔ رات گیارہ بجے واپس پہنچے تو معلوم ہوا سوائے تقی عابدی کے سب لوگ آ چکے ہیں اور وہ بھی پہنچا چاہتے ہیں۔ عازم کوہلی نے ہمارے لیے پہلے سے ایک عدد موبائل فون کا انتظام کر رکھا تھا جو سارے قیام کے دوران ہمارے پاس رہا سو ہم نے مقامی محاورے کے مطابق کچھ ایسے احباب کو فون ''لگائے'' جنھیں فوری طور پر اطلاع دینا ''خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم'' کی ذیل میں آتا تھا صلاح الدین پرویز سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دو بہنوئی گزشتہ چند مہینوں میں انتقال کر گئے اور خود وہ بھی انجیو پلاسٹی وغیرہ کے عمل سے گزر چکا ہے۔ سو میں نے پہلے تو تعزیت کی اور پھر اسے حوصلہ دیا کہ عارضہ قلب فی زمانہ بیماری نہیں بلکہ سٹیٹس سمبل ہے۔

کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۱۸ مارچ صبح دس بجے ساہتیہ اکیڈمی کے ہال میں تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے پونے دس ہو گئے کہ بیرے اگر بہرے نہیں تو انہیں کوئی اور مسئلہ ضرور تھا کیونکہ روٹین کا ناشتہ (آملیٹ' فرائی انڈے وغیرہ) لانے میں بھی انہیں کم از کم پندرہ منٹ لگتے تھے۔ میں نے آلو کا پراٹھا منگوا لیا تھا سو اس کے دس منٹ اضافی سمجھ لیجیے۔ انڈوں کی تیاری کے سلسلے میں بیرے جس تفصیل سے ہدایت لیتے تھے اس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ اس سلسلے میں اندر جا کر مرغیوں سے خصوصی اجازت لیتے ہیں۔ انڈوں کے حوالے سے انور مسعود کا سنایا ہوا ایک جملہ ہر روز ناشتے کی میز پر ایک نیا لطف دیتا تھا۔

بہو نے ناشتے کے لیے اپنے سسر سے پوچھا۔

''ابا جی! آپ کو انڈہ بنا دوں؟''

''نہ بیٹی تو مجھے بندہ ہی رہنے دے۔'' بزرگ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

ساہتیہ اکیڈمی والوں کی بھجوائی ہوئی گاڑیاں نو بجے سے مندوبین کو کانفرنس ہال میں پہنچا رہی تھیں اور ہمارا گروپ بالکل آخری تھا جس میں تقی عابدی بھی شامل تھے انہیں چونکہ اس اجلاس میں بولنا بھی تھا اس لیے وہ بار بار اپنے مخصوص حیدر آبادی تکلف کے ساتھ ساتھیوں کو تاخیر کا احساس دلا رہے تھے اس پر ایک دوست نے کہا' آپ ہمارے پاس ہوائی جہاز کے بورڈنگ کارڈ کی طرح ہیں کہ آپ کے بغیر جلسہ شروع نہیں ہو سکتا' سو خاطر جمع رکھیے۔ اس پر تقی عابدی کچھ بولے تو نہیں مگر انہوں نے ایک ایسی Look دی جو زبان حال سے کہہ رہی تھی۔ ''حال اوے ان پڑھو''

اگرچہ ہم لوگ پورے دس بجے منزل مقصود پر پہنچ گئے مگر یہ دیکھ کر خفت سی ہوئی کہ دیگر مہمانوں سمیت پاکستان کے ہائی کمشنر

عزیز احمد خان بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک اچھے منتظم کی طرح بیک وقت چوکس اور Relaxed نظر آئے۔عزیز احمد خان حسب معمول تپاک سے ملے۔وہ ایک منجھے ہوئے سفارت کار ہیں بھارت جیسے مشکل ملک میں وہ جس خوش اسلوبی سے پاکستان کی نمائندگی کررہے ہیں۔اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ ہم نے ہر ایک کے منہ سے ان کی تعریف سنی۔گزشتہ دنوں انہوں نے جس طرح گلزار صاحب کو احمد ندیم قاسمی صاحب کی عیادت کے لیے انتہائی مختصر وقت میں ویزہ فراہم کیا اس سے یقیناً پاکستانی سفارت خانے کی نیک نامی میں اضافہ ہوا ہے وہ نہ صرف پہلے سیشن میں شامل ہوئے بلکہ آخر تک موجود رہے۔کانفرنس ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔بیرون بھارت سے جتنے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا ان میں سے چند ایک ویزے کے مسائل' علالت یا دیگر وجوہ کی بنیاد پر آنے سے رہ گئے جو پہنچ پائے ان میں لاس اینجلس امریکہ سے نیر جہاں' ان کے شوہر ذہانت صاحب' شاعر فرحت شہزاد نیویارک سے ڈاکٹر عبدالرحمن عبد بمع بیگم' اردو ٹائمز والے خلیل الرحمن بمع بیگم اور برادرم وکیل انصاری جبکہ واشنگٹن سے ڈاکٹر عبداللہ' ٹورنٹو کینیڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی' شکیلہ رفیق اور اطہر رضوی' ماریشش سے یاسمین بودی' برطانیہ سے عبدالغفار عزم' صابر ارشاد عثمانی' رضا علی عابدی اور پاکستان سے ہم تینوں یعنی گلزار جاوید' ناصر بغدادی اور یہ خاکسار آئے تھے۔میری بیگم مندوب تو نہیں تھی پھر بھی اس نے کانفرنس کا بیشتر حصہ اٹینڈ کیا لیکن کچھ اس طرح کہ بقول ساغر صدیقی:

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

غالباً ایسی ہی کیفیت کو فارسی میں "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کہا جاتا ہے۔

کانفرنس کا آغاز سیکرٹری ساہتیہ اکیڈمی سچیدانندن کے انگریزی خطبہ استقبالیہ سے ہوا جو ملیالم کے بڑے زبردست شاعر ہیں اور پچھلے دنوں ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ پاکستان بھی آئے تھے۔یہ خطبہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اسے ہونا چاہیے تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر نارنگ نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں خطبہ استقبالیہ کے بعض حصول کے اجمال کی تفصیل بیان کی اور مائیک نیر جہاں کی طرف بڑھا یا جو جگت آپا ہیں اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی انہیں نیر آپا ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔انہوں نے برصغیر سے باہر اور خصوصاً امریکہ بلکہ لاس اینجلس میں اردو کی ترویج و ترقی اور مسائل کے حوالے سے کچھ باتیں کیں اور چلتے چلتے بغیر نام لیے ریحانہ قمر پر بھی ایک جملہ جڑ دیا جس کی ادبی منظر پر آمد نے کم از کم .L.A کی حد تک ان کے مقابلے میں ایک اور ادبی پلیٹ فارم ضرور پیدا کر دیا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی کی باری تھی۔انہیں چونکہ اس کانفرنس کے بیشتر اجلاسوں میں بولنا تھا اس لیے یہاں انہوں نے ہاتھ ہولا رکھا اور صرف اس کانفرنس کی غرض و غایت اور اردو کی نئی بستیوں کی پیش آمدہ مسائل پر ہی گفتگو کی حاضرین میں

سے جو لوگ فوری طور پر پہچانے جا سکے ان میں مشہور نقاد وارث علوی (جنہیں کچھ دوست بے تکلفی میں فسادی نقاد بھی کہتے ہیں) خواجہ حسن ثانی نظامی' ابوالکلام قاسمی' ش.ک. نظام' مناظر عاشق ہرگانوی' بلراج کومل' سیفی سرونجی' ڈاکٹر مظفر' اعجاز مجید صدیقی' عبدالمنان طرزی' عزیز پریہار' عنبر بہرائچی اور محمد زماں آزردہ شامل تھے۔ کچھ احباب سے بعد میں تعارف ہوا جن کا ذکر حسب موقع آگے آئے گا۔ قرۃ العین حیدر تو اب علالت کی وجہ سے گھر سے کم نکلتی ہیں مگر دہلی کے کچھ معتبر ادیبوں کو وہاں نہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ شمیم حنفی' عتیق احمد' شہپر رسول' شاہد مہدی' زبیر رضوی اور خاص طور پر صلاح الدین پرویز کی عدم موجودگی بہت کھٹکی۔ تصدیق کا موقع تو نہ مل سکا مگر سنا یہی گیا کہ وہاں بھی ہماری طرح گروپ بندیاں عروج پر ہیں اور اگرچہ نارنگ بہت صلح کل اور معاملہ فہم انسان ہیں مگر پھر بھی شاید بقول تاثیر ''کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔''

حیدر آباد سے مجتبیٰ حسین کا فون آیا جو بائی پاس کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اب گھٹنے کے جوڑ کے ہاتھوں سخت پریشانی میں ہیں۔ گزشتہ تینوں سفروں کے دوران دہلی کے قیام میں ان کا بہت ساتھ رہا تھا سو اس بار ان کی کمی زیادہ محسوس ہو رہی تھی کچھ دیر بعد صلاح الدین پرویز سے رابطہ ہوا تو اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ بوجوہ جان بوجھ کر نہیں آیا تھا کہ ادھر بھی آبگینوں کو ٹھیس لگی ہوئی تھی۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ لوکل مسائل میں کبھی نہیں الجھنا چاہیے کہ یہ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کرنے والی بات ہے اور اس سے سوائے بدنامی اور پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا سو میں نے اس موضوع کو چھیڑے بغیر اس سے بات چیت کی۔ آج کل وہ لکھنے لکھانے کے علاوہ صرف سہ ماہی ''استعارہ'' نکالتا ہے اور غالب کے اس مصرعے پر عمل پیرا رہتا ہے کہ ''اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے''

شام کو اس کے اپارٹمنٹ میں کنٹر کے شاعر شو پرکاش اور آل انڈیا ریڈیو پر تنقید والے محمود ہاشمی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں حضرات بہت پڑھے لکھے اور عالمی ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے ہیں۔ سو بات لاطینی امریکہ کے فکشن اور فلسطینیوں کی شاعری کے درمیان گردش کرتی رہی۔ اس دوران میں کچھ شعر و شاعری بھی ہوئی اور ایک بار پھر احساس ہوا کہ برصغیر کی علاقائی زبانوں میں کتنا زبردست ادب لکھا جا رہا ہے مگر ہم اپنے مقامی ادب کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہمارے بیوروکریٹ اردو کے ساتھ کرتے ہیں کہ بقول مشتاق احمد یوسفی:

''ہمارے بیوروکریٹ غلط انگریزی کو صحیح اردو پر ترجیح دیتے ہیں۔''

۱۹ مارچ کانفرنس کا دوسرا دن تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کانفرنسوں کے ابتدائی اجلاس کے بعد حاضری ایک دم کم ہو جاتی ہے

لیکن یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا نہ صرف گزشتہ روز کے سامعین اور مندوبین موجود تھے بلکہ کچھ نئے چہرے بھی نظر آئے۔ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ افتتاحی اجلاس میں خواجہ حسن نظامی کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی بھی قدرے تاخیر سے شامل ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے تعلق کے باعث انہیں بھارتی مسلمانوں کا ایک اہم اور با اثر نمائندہ سمجھا جاتا ہے مگر شخصیت کے اعتبار سے بھی وہ ایک محبتی' ملنسار اور جہاں دیدہ انسان ہیں اور مذہبی پروگراموں سے بھی زیادہ زبان وادب کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں خوش طبع اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع النظر بھی ہیں سو عموی طور پر ہر جگہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے احمد مشتاق کی شاعری پر مقالہ پڑھنا تھا جسے میں یوں بھی سننا چاہتا تھا لیکن ان کی فرمائش کی وجہ سے مزید پابند ہو گیا جس کے نتیجے میں دو تین ایسے مقالے بھی سننے پڑے جو اس ریچھ کی طرح وفادار تھے جس نے مالک کی ناک سے مکھی اڑانے کے چکر میں اس کی ناک ہی اڑا دی تھی۔

احمد مشتاق گزشتہ کئی برس سے نقل وطن کر کے نیو جرسی امریکہ میں جا بسے ہیں یہاں بھی ان کا شمار اپنی نسل کے نمائندہ شاعروں اور پاک ٹی ہاؤس کے مستقل بیٹھنے والوں میں ہوتا تھا' قدرے ہکلا کر بات کرتے تھے جس کے باعث مشاعروں سے گریز کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے بیشتر اشعار اہل ذوق کو زبانی یاد تھے اور ہیں۔

جی بھر آیا کاغذ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہو گئیں

رہ گیا مشتاق دل میں رنگ یاد رفتگاں
پھول مہنگے ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

ابوالکلام قاسمی کا مقالہ ان کے وسیع مطالعے اور حسن ذوق کا مظہر تھا اور انہوں نے احمد مشتاق کے کچھ ایسے شعر بھی سنائے جو

پرانے ہونے کے باوجود نئے اور تازہ لگے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو صرف بہت اچھے شاعروں میں ہی پائی جاتی ہے۔ سنا ہے اب وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا تازہ کلام شمس الرحمن فاروقی کے ''شب خون'' میں نظر آجاتا ہے۔ ''شب خون'' کے ذکر سے یاد آیا کہ گزشتہ تقریباً چالیس برس سے یہ رسالہ اپنے مخصوص انداز، فاروقی صاحب کی مدبرانہ صلاحیتوں اور اپنی اشاعت میں پابندی کے باعث اردو دنیا میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ہی اس کے تازہ شمارے میں مطبوعہ ایک اعلان سے پتہ چلا ہے کہ اس کا آئندہ شمارہ آخری شمارہ ہوگا کہ اپنے ایک سینئر ہم عصر ''افکار'' کی طرح اسے بھی بند کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ فاروقی صاحب نے اس اقدام کی وجوہات بیان نہیں کیں مگر یہ کسی سے ڈھکی چھپی بھی نہیں ہیں کہ اب سنجیدہ ادب سے دلچسپی رکھنے اور رسالہ خرید کر پڑھنے والے اس قدر کم ہوتے جا رہے ہیں کہ رسالے کو ایک ادبی مشن کے طور پر چلانا ممکن ہی نہیں رہا اور جہاں تک اشتہار دینے والوں کا تعلق ہے وہ بھارت میں ہوں یا پاکستان میں اُن کے نزدیک ادب ایک جز وقتی مشغلے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بقول شخصے اب تو خود شاعر اور ادیب بھی رسالوں میں اپنی تحریر کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے۔ میرے خیال میں اب ایک کانفرنس دونوں ملکوں میں اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ ادبی رسالوں کو کیسے زندہ رکھا جا سکتا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جیتا بھابی بھی فردوس کو سینما ہال میں ''بلیک'' فلم دکھانے لے گئیں کہ اس کی نہ صرف وہاں بہت دھوم تھی بلکہ کیبل کے بہت سے چینلز پر ہمارے یہاں بھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ بہتر ماحول اور بڑی سکرین پر اچھی فلم کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے جس کا تجربہ مجھے اگلے دن ہوا۔

انڈین سنٹر کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کا انتظار کرتے ہوئے میری نظر ایک شناسا چہرے پر پڑی جو کچھ یورپین لوگوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ چند لمحوں بعد نظریں ملیں تو چاروں طرف ایک خوبصورت دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ خالد حسن تھے۔ انگریزی صحافت کا ایک بڑا نام اور ایک عمدہ لکھاری جن سے ملاقاتیں یوں تو تیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں لیکن وہ سب کی سب رسمی، مختصر یا اتنی بھاگ دوڑ کے دوران تھیں کہ ان کا حاصل گوروں کے آداب کے مطابق موسم کے حال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ سو آج پہلی بار کچھ باہمی دلچسپی کے امور پر بات کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں وہ زیادہ عرصہ پاکستان سے باہر رہے تھے مگر مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ شعرو ادب اور ڈرامے کے بارے میں ان کی معلومات بہت مفصل، اپ ٹو ڈیٹ اور اعلیٰ درجے کی تھیں جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ آج کل میں اپنے ایک دوست چوہدری یونس کے ساتھ ایک ایسے میوزک البم پر کام کر رہا ہوں جس کی تمام کمپوزیشنز فوک یا کلاسیکل بنیادوں پر استوار ہیں اور جن میں ایک بھی الیکٹرانک ساز استعمال نہیں کیا گیا تو وہ نہ صرف بہت خوش اور متاثر ہوئے بلکہ بہت دیر

تک کرید کرید کر مجھ سے اس کی تفصیلات معلوم کرتے رہے۔ اس دوران میں جاوید جبار بھی آ گئے اگر چہ وہ دو بار وفاقی وزیر بھی رہے لیکن ان کا اصل تعارف اب بھی میڈیا ایڈورٹائزنگ اور سماجی بہبود کا شعبہ ہے۔ دونوں حضرات اپنے اپنے میدان کے ماہر بھی ہیں اور خوش گفتار بھی سو گفتگو کا موضوع ہر پانچ منٹ بعد تبدیل ہونے کے باوجود محفل ایسی جمی کہ لطف آ گیا اس دوران میں بہت سے لطیفے بھی درمیان سے گزرے جو سب سے مزے کا تھا وہ آپ کی نذر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے صدر عام طور پر معمولی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر کی دنیا کے بارے میں ان کی ذاتی معلومات اکثر اوقات عام امریکیوں کی طرح انتہائی ناقص ہوتی ہیں۔ سو ہوا یوں کہ جارج بش کا انتقال ہو گیا جب وہ اگلے جہان پہنچا تو داخلی دروازے پر سینٹ پیٹر نے اسے روکا اور پوچھا کہ تم کون ہو۔ بش بہت جز بز ہوا اور بولا کہ تم مجھے نہیں جانتے' میں امریکہ کا صدر ہوں جارج بش۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں دنیاوی درجے اور تعارف نہیں چلتے اور ہر آنے والے کو اپنی شناخت کروانی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ عرصے پہلے پکاسو آیا اس نے بتایا کہ وہ مصور ہے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے فن کے نمونے دکھائے سو اس نے ایک تصویر بنا کر دکھائی اور اسے داخلہ مل گیا۔ پھر آئن سٹائن آیا اس نے کہا میں سائنس دان ہوں اور میں نے دنیا کو ایٹم کی تھیوری دی ہے۔ استفسار پر اس نے اپنی تھیوری کی وضاحت کی اور اس کی بات مان لی گئی۔ بش نے کہا باقی بات میں بعد میں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ کہ پکاسو اور آئن سٹائن کون لوگ ہیں۔

سینٹ پیٹر نے چند لمحے سوچا اور پھر دروازہ کھول کر کہا' تم اندر جا سکتے ہو کیونکہ تمہاری معلومات سے ثابت ہو گیا ہے کہ تم واقعی امریکہ کے صدر ہو۔

۲۰ مارچ کانفرنس کا اختتامی دن تھا اور آخری اجلاس کی صدارت مجھے کرنا تھی۔ اس صدارت کا واحد فائدہ یہ تھا کہ میں وہ مقالہ لکھنے سے بچ گیا' وقت کی کمی کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔جس کا خلاصہ کر کے سنانا پڑتا تھا جو بہر حال کوئی ایسا اچھا تجربہ نہیں تھا کہ اس سے بات کچھ آدھا تیتر آدھا بٹیر جیسی ہو جاتی تھی۔ ہم سے پہلا یعنی سیکنڈ لاسٹ اجلاس امریکہ میں اردو صحافت کے بارے میں تھا۔ پہلے مقرر اردو ٹائمز والے خلیل الرحمن تھے جو بظاہر ایک مرنجاں مرنج' خوش باش' دلچسپ اور موڈی سے آدمی ہیں لیکن جس طرح سے انہوں نے مسلسل محنت کے ذریعے سے اپنے آپ کو اور اردو ٹائمز کو مستحکم کیا ہے اس سے ان کی دور اندیشی' تنظیمی صلاحیت اور مستقل مزاجی بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ بیشتر قارئین کے لیے یہ بات شاید حیرت اور دلچسپی کا باعث ہو کہ امریکہ اور کینیڈا میں ایک دو مستثنیات سے قطع نظر اردو اخبار اور رسالے مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ایشیائی ہوٹلوں اور سٹورز پر ان کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور سر مہ مفت

نظر کی طرح ان کی کوئی قیمت نہیں بلکہ چشم خریدار پر کوئی احسان بھی نہیں ہوتا یہ اخبارات اور رسائل مقامی اشتہارات سے چلتے ہیں اور ان کے پڑھے جانے کی بنیادی وجہ اپنے وطن' زبان اور تہذیب سے دوری کا وہ احساس ہے جو غیر ملکوں میں اپنے کسی بھی ہم وطن کو دیکھ کر جاگ اٹھتا ہے کہ بقول شخصے آدمی وطن سے نکل جاتا ہے وطن آدمی کے اندر سے کبھی نہیں نکلتا۔

خلیل الرحمن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اردو ٹائمز کے ذریعے ایک مشغلے کو پیشے کی شکل دے دی اور اب یہ اخبار امریکہ کی چودہ ریاستوں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے اور کینیڈا کے بعد اب انگلستان بھی اس کی زلفوں کا اسیر ہونے والا ہے۔ عمومی طور پر ان اخبارات کے مالکان کا مقصد ادب اور صحافت کی خدمت کے بجائے محض صفحے بھرنا ہوتا ہے تا کہ اشتہاروں سے بچنے والی جگہ پر کی جا سکے اور دوسرے یوں کہ یار لوگ اسے اپنے ذاتی تعصبات اور پبلسٹی کا ذریعہ بنا کر اس کی سطح اس حد تک گرا دیتے ہیں کہ اخلاقیات کے تمام معیار ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ اردو ٹائمز بھی توجہ اور مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے لیکن اس نے ایک قابل قبول اخلاقی معیار ضرور قائم کر رکھا ہے سو اس حوالے سے خلیل الرحمن کو اپنی صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر پتہ نہیں کیوں اس نے سارے شمالی امریکہ کے اخبارات کی طرف سے وضاحت کی ذمہ داری اٹھالی اور بڑے جذباتی انداز میں اس بات پر زور دیا کہ وہاں کی صحافت پر گالی گلوچ' کردار کشی اور گھٹیا زبان کا الزام سراسر غلط ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی وجہ تقی عابدی کی پہلے دن کی وہ گفتگو ہو جس میں اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا اور جسے غلطی سے خلیل الرحمن نے اردو ٹائمز پر تنقید سمجھ لیا۔ بہر حال صورت حال اس وقت بہت گھمبیر ہو گئی جب لاس اینجلس اور امریکیوں کی زبان میں ویسٹ کوٹ سے آئے ہوئے شاعر فرحت شہزاد نے مقامی اختلافات پر مبنی ایک انتہائی جذباتی تقریر کی جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ خلیل الرحمن کو پورے شمالی امریکہ کی وکالت کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور یہ کہ گڑ بڑ ہے ضرور مگر ان کی طرف نہیں ہے چونکہ یہ گرما گرمی اس کانفرنس میں پہلی بار پیدا ہوئی تھی اس لیے حاضرین کی دلچسپی میں ایک دم اضافہ ہو گیا مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے یعنی استغاثہ کے بغیر ہی وکیلان صفائی باہم دگر دست و گریبان ہو رہے تھے۔ سو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ موضوع کے بجائے فرحت شہزاد کی بغیر بازوؤں والی شرٹ پر تبصرے کرنے لگے کہ ان کے خیال میں یہ لباس شاید کسی اور تقریب کے لیے زیادہ موزوں تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کے لیے بھی یہ صورت حال خاصی غیر متوقع تھی چنانچہ وہ قدرے دیر سے بحث میں شامل ہوئے مگر ان کی خوش گفتاری بھی فضا کی بلند آہنگی کو اعتدال پر نہ لا سکی اس پر مجھے شیکسپئر کا ایک کھیل ''Much a do for Nothing'' بہت یاد آیا۔

اس کے بعد ہمارے والا یعنی آخری سیشن تھا جس میں خلیجی ریاستوں میں اردو کی صورت حال پر گفتگو تو ہوئی مگر اختلافات کی کوئی خلیج پیدا نہ ہو سکی۔ بحرین کے بزرگ شاعر سعید قیس' دوبئی کے ٹی وی پروڈیوسر اور عالمی مشاعروں کے منتظم مرحوم سلیم جعفری اور عالمی ادبی ایوارڈ اور مشاعروں والی مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے ملک مصیب الرحمن اور محمد عتیق صاحبان کی خدمات کو سب نے سراہا کے ان لوگوں نے اس صحرا کو ادبی حوالے سے نخلستان بنا دیا ہے۔

شاعرف۔س اعجاز کا تعلق کلکتہ سے ہے جہاں سے وہ ادبی رسالہ ''انشاء'' باقاعدگی سے نکالتے ہیں اور ''نقوش'' والے محمد طفیل کی طرح اتنے خاص نمبر نکالتے ہیں کہ عام شمارہ کبھی کبھی شائع ہوتا ہے۔ کانفرنس کے اختتامی جلسے کے بعد اسی ہال میں انشاء کے گوپی چند نارنگ نمبر کی تقریب اجراء تھی جس میں صاحب نمبر اور مدیر و مرتب دونوں کی خدمات کو خوب سراہا گیا۔ نظامت نور جہاں ثروت نے کی بہت سے احباب نے نثر میں اور کچھ شعراء نے نظم کی شکل میں اظہار خیال کیا ان میں مخمور سعیدی اور رفعت سروش جیسے معروف ناموں کے ساتھ ساتھ چندر بھان خیال اور متین امروہوی بھی شامل تھے۔ متین صاحب نے غالب کے ایک مصرعے کی تضمین کے حوالے سے جو نظم پڑھی اسے سن کر مجھے چند برس پہلے کشمیر ریسٹورنٹ نیو یارک میں ہونے والی ایک تقریب بہت یاد آئی۔ ہوا یوں کہ برادرم خالد شاہین بٹ نے جو کیپٹن صاحب کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ میرے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا' خاصے لوگ جمع ہوئے جن میں ایک بہت طرح دار خاتون بھی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق حیدر آباد دکن کے کسی اہم سیاسی خاندان سے ہے۔ پی ایچ ڈی ہیں اور فرنچ اور انگریزی میں لکھتی ہیں وہ بالکل میرے سامنے کی نشست پر بیٹھی تھیں اور ایسی لگاوٹ اور توجہ کا مظاہرہ کر رہی تھیں جیسے ان سے برسوں کی دوستی ہو یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ خطرناک ہو گئی جب انہوں نے سٹیج پر مجھے ایک چٹ بھجوائی جس میں درج تھا کہ میں نے آپ پر ابھی ابھی ایک نظم لکھی ہے اور پڑھنا چاہتی ہوں میں نے چٹ سٹیج سیکرٹری کی طرف بڑھا دی اور گھبرا کر نظریں جھکا لیں کہ اب ان خاتون کے ساتھ سارا مجمع بھی میری طرف دیکھ رہا تھا (کم از کم مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا) خیر کچھ دیر بعد انہیں سٹیج پر بلایا گیا وہ قیامت کے فتنے کے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھیں اور دلوں پر قدم رکھتی ہوئی مائیک پر آئیں اور بہت برطانوی تلفظ کے ساتھ ایک ایسی نظم پڑھی جس میں میرے لیے بہت اچھے اچھے لفظ استعمال کئے گئے تھے میں ابھی اس ماحول کے سحر میں گھرا ہوا تھا کہ کیپٹن شاہین بٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

''سر جی زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں یہ عورت اس سے پہلے یہی نظم چھ مختلف آدمیوں کے بارے میں پڑھ چکی ہے۔''

اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ متین امروہوی بھی اپنی یہی تضمین گزشتہ برس مجھے میرے لیے خاص طور پر لکھی گئی کہہ کر سنا چکے

تھے لیکن ان دو ایک سی باتوں میں جو فرق ہے وہ یقیناً اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

دہلی میں بہت سی آبادیاں ''باغ'' کے نام سے ہیں جن میں سب سے مشہور قرول باغ ہے۔ عازم گروندر سنگھ کوہلی پنجاب باغ میں رہتا ہے اس نے مجھے بتایا کہ یہ آبادی تقسیم کے فوراً بعد بنی تھی اور اس میں زیادہ تر پنجاب کے شرنارتھی آباد ہیں۔ عازم کے دل کی طرح اس کا گھر بھی بڑا ہے اور وہ مہمان نوازی میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا مگر اس کے گھر میں داخل ہونا اور وہاں سے باہر نکلنا اپنی جگہ پر ایک امتحان ہے کہ اس نے ایک دو نہیں پورے چار کتے پال رکھے ہیں اور وہ بھی مختلف سائز اور نسلوں کے۔ سب سے بڑے کا نام رسکن اور چھوٹے والے کا بروٹس ہے۔ یہ نام سن کر مجھے اپنے ڈرامے ''وارث'' کا کتا کرسٹل یاد آ گیا کہ بقول چوہدری حشمت ''کتوں کے نام رکھنا تو کوئی انگریز سے سیکھے'' یوں تو میں نے آج تک کوئی بھی جانور نہیں پالا مگر کتوں سے تو مجھے باقاعدہ الجھن ہوتی ہے۔

کاٹتے رہتے ہیں اہل درد کو
اور کیا خدمت سگ دنیا کریں

یہ اور بات ہے کہ کتا کاٹے تو چودہ ٹیکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن انسان کا کاٹا؟۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں ایک بڑھیا کو پاگل کتے نے کاٹ لیا' ڈاکٹر نے علاج شروع کیا۔ شام کو بڑا ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا تو نرسوں نے بتایا کہ بڑھیا صبح سے مسلسل کچھ لکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا' یہ آپ کیا لکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔ کوئی وصیت وغیرہ؟

''جی نہیں'' بڑھیا نے قلم روکے بغیر کہا۔ ''میں تو ان لوگوں کی فہرست بنا رہی ہوں جنہیں پاگل ہو جانے کی شکل میں' میں نے کاٹنا ہے۔''

عازم کے تین کتے تو گھر سے باہر رہتے ہیں سو انہیں تو باندھ یا پکڑ کر ہمارے داخلے کی صورت نکل آئی تھی مگر چھوٹے والا جس کا نام میں نے سپارکل چھوٹو رکھا ہوا تھا پورے گھر کی آنکھوں کا تارا تھا وہ طبیعتاً بہت مجلسی واقع ہوا ہے چنانچہ اپنے آقاؤں سے بڑھ کر حق میزبانی ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مہمانوں کو ایک پل تنہا نہیں چھوڑتا۔ حیرت ہے کہ فردوس جو عام طور پر کتوں سے بہت ڈرتی ہے بروٹس سے بہت جلد مانوس ہو گئی اور مجھے شیکسپیئر کی زبان میں کہنا پڑا کہ

Yet Brutas was an honourable dog.

خیر یہ تو ایک تفنن کی بات تھی کیونکہ اگر غور کیا جائے تو اس جانور کی عادت والے انسان آپ کو قدم قدم پر مل جائیں گے اور ان میں

سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے کاٹے کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ عازم کی بڑی بیٹی منیت عرف شینا (جس کا نام شیریں بھی ہے جو عازم کی بہن کا رکھا ہوا ہے جو ایران میں رہتی ہے) کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ سفر کے احوال ''سات دن'' میں کیا تھا اس دوران میں اس کی سگائی ہوگئی اور وہ اس برس ۲۴ دسمبر کو پیا گھر سدھار جائے گی۔ کسی نے کہا تھا کہ سکھوں کے بچے بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر پھر بڑے ہو جاتے ہیں لیکن شینا کا منگیتر بڑا ہو جانے کے باوجود بہت سمارٹ اور وجیہہ ہے البتہ اپنی دلہن کے پالتو بروٹس کے بارے میں اس کے خیالات سے آگاہی نہیں ہو سکی گا لباً وہ بھی یہی کہے گا کہ

I love thou, I love thy dog

خواتین کو شاپنگ کے لیے بھیج کر ہم دونوں فلم ''بلیک'' دیکھنے نکل گئے۔ اس کی وہاں بہت دھوم تھی۔ فلم ایک چھوٹے سینما گھر میں جنہیں ملٹی پلیکس کہا جاتا ہے لگی ہوئی تھی۔ سنا ہے اب پاکستان میں بھی اس طرح کے سینما گھر بن رہے ہیں کہ کسی بڑے شاپنگ مال میں دو ڈھائی سو سیٹوں والے کچھ ہال ساتھ ساتھ بنا دیے جاتے ہیں جن میں مختلف فلمیں چلتی رہتی ہیں۔ سینما کا اندرونی ماحول بہت اچھا تھا۔ عمدہ سیٹیں شاندار سکرین اور بہترین ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ فلم دیکھنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے اس سے قطع نظر کہ ڈائریکٹر اور رائٹر نے رانی مکھرجی کے کردار میں تنوع اور شدت پیدا کرنے کے لیے اسے بیک وقت' بہرا گونگا اور اندھا اور ذہنی طور پر غیر متوازن بنا دیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ فلمی لائسنس لیتے ہوئے امیتابھ بچن کو اندھے کے ساتھ ساتھ گونگے بہروں کی زبان میں باتیں کرتے دکھایا گیا تھا یعنی وہ ہاتھوں کے اشاروں اور آواز کے ذریعے رانی سے بات چیت کرتا تھا جبکہ وہ نہ دیکھ سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی لیکن اس مجبوری سے قطع نظر یہ ایک لاجواب فلم تھی۔ امیتابھ بچن اور رانی مکھرجی کی اداکاری تو توقع کے مطابق عمدہ تھی ہی مگر رانی کے بچپن کا کردار کرنے والی بچی نے کمال کر دیا۔ کہیں کہیں تو وہ امیتابھ بچن سے زیادہ سین پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں نئی اور اچھی بات کہنے کرنے کی گنجائش ہے جس کی وجہ سے تمام تر عریانی زدہ گلیمر کے باوجود چند ایک اچھی فلمیں ہر سال بن ہی جاتی ہیں۔ اس فلم کے ڈائریکٹر سنجے لیلا رام بھنسالی نے پچھلے برس ''دیوداس'' بنائی تھی جو ایک بہت مہنگی اور شاندار فلم تھی جس میں حقیقت اور Fantasy کو زبردست کمرشل انداز میں پیش کیا گیا تھا جبکہ ''بلیک'' بغیر کسی گانے اور گلیمر کے اپنی جگہ پر ایک موثر اور زبردست فلم ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر ایک بار پھر خیال آیا کہ ہم ایسا کام کیوں نہیں کرتے۔

بھارت جا کر ''تاج محل'' نہ دیکھنا بڑی بدذوقی کی بات ہے (ویزا نہ ہو تو بات دوسری ہے) ۲۲ مارچ کا دن اس کے لیے پہلے سے طے تھا۔ سڑک بہتر حالت میں تھی اور ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ سو تقریباً چار گھنٹے میں ہم لوگ آگرہ پہنچ گئے۔ صوفیا کے مزاروں کی

طرح ان تاریخی مقامات کا بھی ایک اپنا کلچر ہے کہ ان پر مختلف طرح کے مافیاز نے قبضہ کر رکھا ہے۔ مقامی فوٹوگرافروں اور انتظامیہ کی ملی بھگت سے سیاحوں کو موبائل کیمرہ اور مووی کیمرہ اندر لے جانے سے روکا جاتا ہے حالانکہ ان تینوں چیزوں کا تاج محل کی سکیورٹی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ مقامی اور سیاحوں کے داخلہ ٹکٹ میں اتنا زیادہ فرق کیوں رکھا گیا ہے۔ یہ تو سیاحوں کا سراسر استحصال ہے کہ انہیں بیس روپے کی بجائے سات سو پچاس روپے فی کس کے حساب سے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس پر مجھے اپنے ایک بزرگ بہت یاد آئے' جو ۱۹۱۵ء میں حج کے لیے گئے تھے اور وہاں کے طویل قیام کے باعث تھوڑی بہت عربی بھی سیکھ گئے تھے۔ ایک دن سبزی فروش نے ان کو تاج محل کے ٹکٹ جیسے فرق کے ساتھ سبزی کا بھاؤ بتایا تو احتجاجاً ان کی عربی اور پنجابی کچھ اس طرح گھل مل گئی۔ ''یا شیخ! یا شیخ۔۔۔۔۔ انج ہی ہماری پچی گھٹ سٹو۔'' یعنی اس سے بہتر ہے کہ تم سیدھی طرح ہماری گردن دبا دو۔

''تاج محل'' کی خوبصورتی اور دبدبہ کچھ ایسا ہے کہ اس پر بات کرتے وقت عام طور پر خیال ہی نہیں آتا کہ یہ اصل میں ایک مقبرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اس کے متعلق ایسی ایسی رومانی اور انقلابی باتیں کرتے ہیں جن سے کم از کم ''قبر'' کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک شاعر فرماتے ہیں۔

یہ الگ بات کہ شرمندۂ تعمیر نہ ہوں
ورنہ ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

اور ساحر لدھیانوی کی وہ نظم تو کسی تعارف کی محتاج نہیں' جس میں وہ کہتا ہے۔

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

سو ان ملے جلے خیالات کے ہجوم میں جب ہم لوگ یعنی عازم کو ہلی' میتا کو ہلی اور میں اور میری بیگم آگرہ پہنچے تو ماضی' حال اور مستقبل کچھ گڈمڈ سے ہو گئے۔ ایک طرف اکبر کا مزار' آگرے کا قلعہ اور تاج محل تھے' دوسری طرف تیسری دنیا کے ایک پسماندہ اور غریب شہر کے در و بام اور تیسری طرف سائیکل رکشا میں بیٹھے ہوئے ایک آدم زاد کے ذہن کے کچھ اندیشہ ہائے دور و دراز!

تاج محل کو اگر عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے تو یہ کوئی بحث طلب بات نہیں کہ فن تعمیر کا ایسا شاہکار زمین کے تختے پر شاید ہی کوئی ہو اور اس کا حسن تناسب اور نقشہ کچھ ایسا ہے کہ انسانی عقل ورطۂ حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ تین سو برس پہلے کے زمانے اور

سہولیات کو ذہن میں رکھیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسی عظیم عمارت کیسے سوچی اور تعمیر کی گئی۔ مغل فن تعمیر کی روایت کے مطابق اس کی حدود میں داخل ہونے کے لیے سنگ سرخ سے بنے ہوئے ایک بہت بڑے ڈیوڑھی نما دروازے سے گزرتے ہیں تو عین سامنے وہ جھروکا سا نظر آتا ہے جہاں ممتاز محل دفن ہے اور دل سے بے اختیار اس فنکار کے لیے داد نکلتی ہے جس نے اس کو جیومیٹریکل ڈرائنگ بنائی اور پھر اس تصور کو حقیقت کی شکل دی تھی۔ ابتدائی کارروائی کے طور پر ایک چالاک فوٹوگرافر سے تصویریں بنوائی گئیں جن کے پرنٹ ہمیں ایک گھنٹے میں تیار ملنے تھے۔ ''چالاک'' میں نے اس لیے کہا کہ فوٹوگرافروں کے ایک بہت بڑے ہجوم میں وہ ہمیں اپنی ہنرمندی کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ ان میں ایک سے ایک چرب زبان پڑا تھا۔ موسم قدرے گرم تھا اور مسز کوہلی اپنے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھنے سے گریزاں تھی۔ سو طے پایا کہ عازم ان کو کمپنی دے اور ہم دونوں میاں بیوی ساری عمارت کا راؤنڈ لگا لیں۔ جو کوئی بہت مختصر بھی نہیں تھا مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے برس پہلی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بائیں ہاتھ کی طرف کچھ لوگ جوتوں کے غلاف لیے بیٹھے تھے جو جوتوں پر چڑھا دیے جاتے تا کہ عمارت کا فرش صاف ستھرا رہے۔ میری نظر چوک گئی اور میں انہیں نہ دیکھ سکا اور ہم نے باقی لوگوں کی طرح جوتے اتار کر دیوار کے ساتھ رکھ دیے جہاں بلا مبالغہ سینکڑوں جوتے رکھے تھے۔ ایک بار جی میں آیا کہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کرنا چاہیے مگر مرکزی عمارت کو دیکھنے کی جلدی کچھ ایسی تھی کہ ہم نے اس طرف زیادہ توجہ نہ کی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا لیکن اس کا ذکر مناسب وقت پر ہوگا' ابھی سے یہ بتانے کا کیا فائدہ کہ واپسی پر فردوس کے نئے اور پسندیدہ جوتے وہاں نہیں تھے۔

کتابوں اور گائیڈوں کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت صرف ''ایک قبر'' کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی اور شاہ جہاں نے اپنے لیے کچھ فاصلے پر جمنا کے دوسرے کنارے سنگ سیاہ سے ایک ایسا ہی مقبرہ بنوانے کا منصوبہ بنایا تھا جس کی بنیاد اس کے دور اقتدار میں ہی رکھ دی گئی تھی لیکن اس کے بیٹے اورنگزیب عالمگیر نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور باپ کو ماں کے پہلو میں ہی دفن کر دیا جس سے اس بے مثال عمارت کے جمالیاتی حسن کو یقیناً نقصان پہنچا کہ اس کا نقشہ صرف ایک قبر کو سنٹر کر کے بنایا گیا تھا لیکن جہاں خون کے رشتے بے معنی ہو جائیں وہاں جمالیات کی کون پروا کرتا ہے۔

مرکزی عمارت کی سطح زمین میں سے تقریباً اسی فٹ بلند رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف عمارت کے پیچھے کی کوئی چیز اس کے نظارے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ یہ ہر اعتبار سے مختلف منفرد اور علیحدہ بھی نظر آتی ہے اس کی چمک دمک' سنگ تراشی' جالیوں کی بناوٹ' ہنرمندی اور زیب زینت کے لیے بنائے گئے نقش و نگار اور عربی خطاطی کے کمالات ایسے ہیں کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

جوتی چوری کے تجربے سے محظوظ ہونے کے بعد میں کچھ دیر کے لیے ایک گھاس کے قطعے پر لیٹ گیا اور زمان ومکاں کی اس شعبدہ گری میں پھر سے گم ہو گیا جو مجھے ہمیشہ مسحور رکھتی ہے۔ یہ تصور کہ ہم سے پہلے یہاں سے کیا کیا لوگ' کب کب گزرے تھے' ان ہواؤں میں ہم سے پہلے جن لوگوں نے سانس لیا تھا وہ ہمارے اندر کیسے در آتے ہیں' کیوں ہمیں کبھی نہ دیکھی ہوئی جگہیں مانوس لگتی ہیں اور گزرا وقت کیسے ہمیں پھر سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

نہ جانے کب تھا کہاں تھا' مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کہیں گزارا ہے
ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نہ جانے ہم ہیں دوبارا کہ یہ دوبارا ہے!

کچھ دیر بعد ایک فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں ویجی ٹیبل پیزا کھاتے ہوئے دنیا پھر اپنی جگہ پر واپس آ چکی تھی اپنی اپنی تھکن اور مجبوریاں پہنے ہوئے لوگ چاروں طرف آ جا رہے تھے اور گفتگو اصل تاج محل کے جمال سے نکل کر اس موضوع کے گرد گھوم رہی تھی کہ سووینیر کے طور پر بنائے جانے والے اس کے ماڈل کہاں سے بہتر اور سستے ملتے ہیں یہاں بیٹھے ہوئے مجھے گزشتہ سفر کا گائیڈ رائے زادہ اور شریک سفر ڈاکٹر تقی عابدی بھی بہت یاد آئے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ کہیں آس پاس ہی ہوں مگر کیلنڈر اور گھڑیاں کچھ اور ہی بتا رہی تھیں' ایک بے نام سی اداسی کے سائے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ میں وہاں موجود تو تھا مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ذات کا کچھ حصہ کہیں اور رہ گیا ہو۔ وہ علاقہ کون سا ہے؟ ماضی ہے یا مستقبل۔۔۔۔۔۔۔ جو نسل در نسل اور زمانہ در زمانہ ہماری طرح اس کائنات میں محو سفر ہے یہاں آ کر سارے علوم رک جاتے ہیں اور صرف غالب کا یہ مصرعہ گونجتا رہ جاتا ہے کہ

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ایک امریکن سیاح یورپ کے سفر پر نکلا تو قابل دید تاریخی مقامات کی ایک طویل فہرست اس کے ساتھ تھی جسے اس نے کچھ اس طرح سے بھگتایا کہ جب پیرس میں دریائے سین کے کنارے اس کے ٹورسٹ گائیڈ نے بس رکوائی اور اعلان کیا کہ اس وقت ہم مشہور تاریخی دریا سین کے کنارے پر کھڑے ہیں تو امریکی سیاح نے بس کی کھڑکی سے دریا پر ایک نظر ڈالی اور اپنی فہرست میں دریائے سین پر لکیر پھیرتے ہوئے کہا۔

Oh, it is river sane, ok, seen.

لیکن نہ تو ہم طبعاً امریکی سیاح تھے اور نہ تاج محل وریائے سین' سو ہم اس خوشگوار تجربے سے "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتن" کی طرح گزرے۔ عازم کوہلی کے کسی دوست کے فارم ہاؤس پر ایک ڈنر تھا جس کی خاص بات راجستھان کی مخصوص گائیکی کے نمائندہ فنکار "لانگا" گروپ کی پرفارمنس تھی۔ میزبانوں نے ہم میاں بیوی کو بھی دعوت دی جو ہم نے اس لیے بلاتوقف قبول کرلی کہ اس کے ذریعے وہاں کے کلچر سے تعارف کے ساتھ ساتھ "حسن سماعت" کا موقع بھی نکل رہا تھا۔

فارم ہاؤس اپنے مکینوں کے تموّل اور حسن ذوق کا نمائندہ تھا۔ معلوم ہوا کہ اس دعوت میں "ہولی" کے استقبال کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ وسیع لان میں ایک طرف ماکولات اور دوسری طرف مشروبات کے سٹالز تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی خوش نما اور انتہائی ہنس مکھ خاتون ہر کام میں آگے آگے تھی۔ عازم نے بتایا کہ یہ جنرل جگجیت سنگھ اروڑی کی بیٹی ہے۔ ایک دم ذہن میں گھنٹی بجی اور سقوط ڈھاکہ مشرقی پاکستان' پلٹن میدان ڈھاکہ اور جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے مناظر نیون سائن کی طرح حافظے میں جلنے بجھنے لگے۔ کچھ لمحے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس اطلاع پر میرا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ عازم کوہلی میری ذہنی حالت سے بے خبر اس خاتون کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتا جارہا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے اور اس کا مرض خاصی ایڈوانس سٹیج پر ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کو انتہائی خوش دلی اور بہادری سے جی رہی ہے اور یہاں بھی مہمان ہوتے ہوئے میزبانوں سے زیادہ سرگرم ہے۔ کچھ دیر بعد اس خاتون نے مائیک پر آکر بڑی عمدہ انگریزی ملی اردو میں مہمانوں کا سواگت کیا اور راجستھانی موسیقی کے حوالے سے آج کے موسیقاروں کا تعارف کروایا یہ فنکار بڑے سیدھے سادھے اور نیم دیہاتی سی لوگ تھے۔

ان کے لیڈر محمد علی لانگا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنے گروپ اور ان آئٹمز کا تعارف کروایا جو وہ پیش کرنے والے تھے اور پھر بڑی سادگی سے یکدم گانا شروع کردیا۔ اکثر آئٹمز کو سننے کے دوران حافظے میں انڈین فلموں کے کچھ بہت عمدہ اور یادگار گانے یاد سے آکر رہ جاتے تھے لیکن جب انہوں نے "کیسریا بالما" شروع کیا تو برادرم گلزار کی فلم "لیکن" جیسے سامنے چلنا شروع ہوگئی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ راجستھانی موسیقی سے گلزار کو بے حد دلچسپی ہے اور وہ اکثر و بیشتر اس کی دھنوں کو اپنے گانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ محفل اپنے اختتام کے قریب تھی اور کھانا کھلنے ہی والا تھا کہ یکدم انہوں نے میرا لکھا ہوا ایک گیت "لگن لاگی من کی لگن" گانا شروع کردیا' جو میں نے مرحوم نصرت فتح علی خان کے لیے لکھا تھا اور جو ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے راحت فتح علی خان نے نہ صرف ریکارڈ کرایا تھا بلکہ اسے مہیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ نے اپنی فلم "پاپ" میں بطور ٹائٹل سانگ بھی استعمال کیا تھا۔ میں اس

خوشگوار اتفاق سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ عازم کے ذریعے انیتا اروڑہ اور پھر گانے والوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ اس گیت کے لکھیک اس محفل میں موجود ہیں۔ سو اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا اور گیت کوئی بار سنا گیا۔ آخر میں فنکاروں نے آ کر اپنے مخصوص انداز میں میرے پاؤں چھوئے اور حاضرین نے کم و بیش فرداً فرداً مجھ سے تعریفی کلمات کہے۔ فن اور فنکاروں کی اس قدر افزائی سے بے اختیار ذہن اپنے معاشرے کی طرف گیا جہاں سرکاری طور پر موسیقی سے متعلق لوگوں کو اب بھی ''ارباب نشاط'' کہا جاتا ہے جس کا مہذب ترین انگریزی متبادل Entertainer ہے اور جہاں اصل اور رموز فن جاننے والے فنکاروں کو عزت تو کیا دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ بہت برس پہلے ایک بار میں نے برادرم خالد آفتاب کے گھر پر مشہور لوک گلوکار طفیل نیازی مرحوم سے انڈیا اور پاکستان کے ثقافتی رویوں کا فرق دریافت کیا تھا اور اس کا جملہ آج بھی مجھے اداس کر دیتا ہے' اس نے کہا تھا۔

''سرکار' اٹاری اور واہگہ کے درمیان صرف دو سو گز کا فاصلہ ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ اٹاری کے بارڈر پر لوگ ہمیں عظیم فنکار اور بھگوان کہہ کر بلاتے ہیں اور واہگہ کراس کرتے ہی ہم میراثی اور بھانڈ بنا دیئے جاتے ہیں۔''

جس طرح ہمارے ہاں پی آئی اے کے ساتھ اب کچھ نجی کمپنیاں بھی ہوائی سروس کے شعبے میں کام کر رہی ہیں اس طرح انڈیا میں بھی سرکاری ایئر لائنز' ''ایئر انڈیا'' اور ''انڈین ایئر لائن'' کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں پرائیویٹ ایئر لائنز تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہیں اور ان میں سے کئی ایک خاصی بڑی بلکہ بہت بڑی ہیں اور ان کا سسٹم بھی یورپ اور امریکہ جیسا ہے کہ مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ آئے دن نئے سے نئے پیکج نکالتی رہتی ہیں۔ ہمیں بھی جیٹ ایئر لائن کا ایک ایسا ہی پیکج مل گیا جس کے نتیجے میں سولہ سے اٹھارہ ہزار والی ٹکٹ دس ہزار میں مل گئی۔ پچھلی بار میں نے انڈین ایئر لائنز پر سفر کیا تھا جس کی یادیں کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھیں لیکن جیٹ ایئر لائنز کا جہاز اور عملہ دونوں بہتر تھے یہ اور بات ہے کہ بیگم کی موجودگی کے باعث عملے پر زیادہ توجہ دینا ممکن نہ تھا۔ ممبئی ایئر پورٹ پر سلیم عارف منتظر کھڑے تھے۔ گزشتہ بارہ برسوں میں ان کی شہرت عمر اور جسم تینوں بڑھے اور پھیلے ہیں۔ سو اب انہیں لڑکا کہنا تو قدرے مشکل ہے مگر ان کی مسکراہٹ کی اپنائیت اور گرم جوشی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ گاڑی میں سامان رکھوانے کے دوران انہوں نے بتایا کہ گلزار صاحب کو کسی روٹین میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا تھا سو وہ ایئر پورٹ تو نہیں آ سکے مگر اس وقت ہمارے ہوٹل میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں جو کہ ساحل پر واقع ہے اور اس کا نام بھی سی سائیڈ ہوٹل ہے جو ان کے گھر یعنی باندرہ سے کوئی بہت زیادہ دور نہیں۔

میری بیگم فردوس کے ذہن میں انڈین فلموں اور فلم ایوارڈ شوز کے گلیمر کے باعث انڈین اداکاروں کے گھروں اور رہائشی علاقوں

کے بارے میں تصور غالباً بہت مختلف تھا چنانچہ جب سلیم عارف نے ہمارے سمن آباد جیسی ایک آبادی میں واقع بڑے بڑے سٹارز کے گھروں کی نشاندہی کی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ امیتابھ بچن کے نئے اور پرانے دونوں گھر ہوٹل کے قریب ہی واقع تھے مگر ان کا بیرونی منظر بھی گزارے لائق تھا۔ البتہ یہ اطلاع اہم تھی کہ اس کا سکیورٹی کا عملہ خاصا بڑا ہے اور پولیس کی خصوصی گارڈ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود رہتی ہے۔ ہوٹل کے چھوٹے سے استقبالیہ میں گلزار بھائی اپنی مخصوص خوشگوار اور بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھوں میں ایک خوبصورت گلدستہ لیے ہمارے منتظر تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اردو کا معانقہ کرنے کے بجائے پنجابی کا ''جپھا'' بلکہ جپھی ڈال کر ملتے ہیں۔ سو یہ خوبصورت رسم یہاں بھی نباہی گئی اور ان کے مشورے کے مطابق ہم پانچویں منزل پر واقع اپنے کمرے میں سامان رکھ کر فوراً ہی ان کے ساتھ چل پڑے کہ لنچ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ لنچ ایک ایسے چینی ہوٹل میں کیا گیا جو باہر سے ہوٹل تو کیا' کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا لیکن اندر سے نہ صرف بہت معقول تھا بلکہ اس کا کھانا بھی عمدہ اور خوش ذائقہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کھانوں کا بھی اصل چینی کھانوں سے اتنا ہی تعلق تھا جتنے ہمارے یہاں ہوتا ہے اس پر مجھے اپنے چینی شاعر دوست چانگ چی شوان عرف انتخاب عالم کا یہ جملہ بہت یاد آیا جو اس نے ہمارے لاہور کے میکا نگ ہوٹل میں ایک دعوت کے بعد کہا تھا۔

''مجھے نہیں پتہ تھا یہاں چینی ہوٹلوں میں پاکستانی کھانا بھی ملتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ کل ہولی کے تہوار کی وجہ سے شام چار بجے ہوٹل کے کمرے سے نکلنا ممکن نہ ہوگا سو سوائے ٹی وی پر پاک بھارت تیسرا ٹیسٹ میچ دیکھنے کے ہمارے پاس کوئی آپشن نہ ہوگا یعنی ہمارے پاس آج اور کل کی شام کے علاوہ صرف پرسوں کا دن ہے کیونکہ اس سے اگلے دن یعنی ۲۸ مارچ کی شام ہی ہماری واپسی کی فلائٹ بک ہے۔ ابھی ہم مہیا اور میسر وقت کی جمع تفریق میں مصروف تھے کہ اختر آزاد صاحب کا فون آ گیا جو پہلے دن سے ہم سے رابطے میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لتا جی یعنی لتا منگیشکر اس وقت پونا میں ہیں اور ہماری واپسی سے قبل ان کا ممبئی پہنچنا مشکوک ہے کیونکہ آج کل اکثر بڑے فنکار ہولی کے دنوں میں شائقین کے ہجوم اور بے جا مداخلت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور لتا جی تو ویسے بھی اب زیادہ وقت پونا میں ہی گزارتی ہیں۔ البتہ فون پر وہ ضرور رابطہ کریں گی کہ آئندہ ہفتے وہ میری ایک غزل اپنی نئی سی ڈی میں ریکارڈ کرانے والی ہیں۔ فردوس کو یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ امیتابھ بچن اور جیا بچن بھی اس حوالے سے گوا جا چکے ہیں اور پتہ نہیں کب واپس لوٹیں گے (کہ اس پروگرام میں ان لوگوں سے ملنا بھی شامل تھا) طے پایا کہ آج رات کو راج کپور کے مشہور پرتھوی تھیٹر میں ڈرامہ دیکھا جائے جو ہمارے ہوٹل سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع ہے کیونکہ اس کا غالب امکان ہے کہ آئندہ دو راتوں میں شاید اس کے لیے وقت ہی نہ نکل سکے۔ عدنان سمیع

خان سے فون پر رابطہ ہوا اس کی آواز کی گرم جوشی اور محبت بھرے لفظوں سے اندازہ ہوا کہ بے پناہ شہرت اور کامیابی کے باوجود اس کا دماغ اپنی جگہ پر ہے اور وہ ایک اچھے اور خاندانی انسان کی طرح وضع داری اور تعلقات نبھانا اور رشتوں کی قدر کرنا جانتا ہے۔ اس نے کہا کہ کل سہ پہر اس کا ڈرائیور ہمیں ہمارے ہوٹل سے لے آئے گا اور پھر شام ہم مل کر گزاریں گے اور بہت ساری باتیں کریں گے۔

سٹیج پلے کا نام ''جنھے لاہور نہیں ویکھیا'' تھا۔ سلیم عارف نے بتایا کہ یہ چند برس پہلے لاہور کے کسی ڈرامہ فیسٹول میں بھی کھیلا جا چکا ہے۔ اس کے ہدایت کار فلم اور سٹیج کے سینئر اداکار ڈینش ٹھاکر ہیں اور اس کا پس منظر تقسیم ہند کے فوراً بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے متعلق ہے' جب برصغیر کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ کھیل کا مرکزی کردار ایک بوڑھی ہندو عورت تھی جو ہنگاموں کے دوران پاکستان میں واقع اپنے گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے اور یہ گھر بھارت سے آئے ہوئے ایک مسلمان مہاجر خاندان کو الاٹ ہو جاتا ہے جو شروع میں اسے وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں مگر پھر اسے بزرگوں جیسا سمجھنے لگتے ہیں۔ مفادات' فسادات' جہالت اور انتقام اور نیکی بدی کی ازلی کشمکش میں بالآخر فتح انسانیت کی ہوتی ہے۔ کھیل ہر اعتبار سے درمیانہ درجے کا تھا مگر تھیٹر کا ماحول اور پیش کش کا انداز بہت خوبصورت تھے۔

عدنان سمیع خان سے کوئی تین گھنٹے کی بہت پرلطف ملاقات رہی اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں کا سپر سٹار ہے اور کامیابی کے جھنڈے گاڑتا ہی چلا جا رہا ہے اس کا وزن اگرچہ پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے لیکن چہرے کی معصومیت اور فن سے اس کی وابستگی ایسی غیر معمولی ہے کہ دھیان اس کے تن و توش کی طرف جاتا ہی نہیں۔ مرحوم نصرت فتح علی خان کی طرح اس کی انگلیاں بھی ساز کو چھیڑنے کے لیے بے چین رہتی ہیں سو اس محفل میں اس نے مجھے میری ایک غزل کی کمپوزیشن سنائی جو اس نے آٹھ برس قبل ایک بار لاہور میں مجھے گنگنا کر سنائی تھی۔ عدنان چونکہ بنیادی طور پر غزل کا سنگر نہیں ہے اس لیے اسے کچھ مسائل کا سامنا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے باہمی مشوروں اور ترمیم و اضافہ کے بعد جب دھن کی مطلوبہ صورت نکل آئی تو اس نے ایک بڑے مزے کی بات کہی' کہنے لگا۔ ''آٹھ برس سے یہ غزل میرے ذہن میں تیار تھی لیکن میں اسے ریکارڈ نہیں کرا رہا تھا' اب میری سمجھ میں اس کی وجہ آئی ہے کہ دراصل یہ اپنی تکمیل کے لیے آج کی ملاقات کا انتظار کر رہی تھی۔''

جاوید صدیقی کا نام سٹیج ڈرامے اور فلم کے حوالے سے بہت معروف اور محترم ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اداکار راج ببر کی بیگم (جو مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کی صاحبزادی ہیں) نادرہ ببر ان کا ایک سٹیج کھیل ''بیگم جان'' لاہور کے ایک ڈرامہ فیسٹول میں لے کر آئی تھیں جو مختلف حوالوں سے اخبارات میں شہ سرخیوں کا موضوع بھی بنا تھا۔ فلموں میں چونکہ چند بڑے سٹارز کے ناموں کے علاوہ

باقی ٹائٹل اس تیزی سے گزارے جاتے ہیں جیسے کوئی ناگوار فرض پورا کیا جا رہا ہے اس لیے ممکن ہے پاکستانی ناظرین اس بات سے آگاہ نہ ہوں کہ ان کی چند بہت ہی پسندیدہ فلمیں جاوید صدیقی کی ہی لکھی ہوئی ہیں جو چند نام فوری طور پر یاد آرہے ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

دل والے دلہنیا لے جائیں گے ــــــــ امراؤ جان ادا ــــــــ ڈر ــــــــ تہذیب ــــــــ راجہ ہندوستانی ــــــــ زبیدہ ــــــــ جال ــــــــ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صاحبزادی عزیزہ لبنیٰ سلیم عارف کی نصف بہتر ہیں اور ہندوستانی محاورے کے مطابق سارا خاندان فنون لطیفہ سے جڑا ہوا ہے۔ رات کا کھانا ان کی طرف تھا جہاں سعودی عرب سے آئی ہوئی ان کی بہن اور بھانجی بھی موجود تھے۔ سو گفتگو اپنی مرضی سے ٹریک بدلتی رہی اور صورت حال کچھ کچھ ایک فلمی گانے کے مکھڑے جیسے ہوگئی کہ

کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے

جاوید صدیقی ایک بہت محبت والے اور نفیس انسان ہیں اور ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی شہرت Deserve اور انجوائے تو کرتے ہیں مگر اس کی رو میں بہہ نہیں جاتے اور اپنا ہر کام پوری محنت اور دیانتداری سے کرتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے پروگرام بنا کر پرتھوی تھیٹر میں آج ڈینش ٹھاکر کے ایک کھیل "ہائے میرا دل" کا ہزاروں شو ہے سو یہ کھیل مل کر دیکھا جائے۔ ڈینش ٹھاکر کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی اور ہم بھی یہ جان سکیں گے کہ بھارت میں "مزاح" کے نام پر کیا بلکہ کیا کیا ہو رہا ہے۔

پرتھوی تھیٹر کی کینٹین پر بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہاں ڈرامے کی روایت کتنی گہری اور مضبوط ہے۔ یہاں پرتھوی راج کی پوتی اور ششی کپور کی بیٹی سجنا کپور سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل اس تھیٹر کو چلا رہی ہے۔ فردوس نے بتایا کہ کچھ برس پہلے یہ کسی فلم میں ہیروئن بھی آئی تھی اس کے چہرے اور آنکھوں کے رنگ میں اس کی ماں جنیفر کی شباہت بہت نمایاں تھی۔ ڈرامہ سکرپٹ اور اداکاری کے اعتبار سے ٹھیک ٹھاک تھا مگر اہم اور زیادہ خوبصورت بات اس کی مختصر اختتامی تقریب تھی جو بیک وقت انتہائی سادہ اور پروقار تھی کہ پذیرائی کرنے اور کرانے والوں کی بنیادی اہلیت صرف اور صرف فن سے کمٹڈ ہونا تھا۔

اگلا دن جو ممبئی میں ہمارے اس دورے کا آخری دن تھا' گلزار صاحب کے نام تھا۔ سلیم عارف کے ساتھ ہم پالی ہلز باندرہ میں

ان کے مکان ''بوسکینا'' پر پہنچے (گلزار کی بیٹی میگھنا کا پیار کا نام ''بوسکی'' ہے اور اس کے نام بھی رکھا گیا ہے) تو وہ حسب معمول سفید براق کرتے پاجامے اور کھسے میں ملبوس ہمارے منتظر تھے۔ میں اس گھر میں دس بارہ سال پہلے بھی آ چکا تھا مگر ہر چیز نئی سی لگ رہی تھی۔گلزار نے بتایا کہ اب انہوں نے اپنا دفتر بھی یہیں شفٹ کرلیا ہے جس کی وجہ سے اس علاقے کی Look تبدیل ہوگئی ہے۔ پتھروں اور درختوں سے ان کی دلچسپی ہر ہر چیز سے نمایاں تھی۔ کمرے میں سکھ، ہندو اور اسلام تینوں مذاہب کی نشانیاں ساتھ ساتھ تھیں بھگوان کی مورتی، کرپان اور چاروں ''قل'' مختلف دیواروں پر آویزاں تھے۔سلیم عارف نے بتایا کہ ایک مرحوم دوست کی یاد کے حوالے سے گلزار ماہ رمضان میں باقاعدگی سے کچھ روزے بھی رکھتے ہیں۔

ایک طرف دیوار پر مختلف مشہور کارٹونسٹوں کے بنائے ہوئے گلزار کے کارٹون بھی آویزاں تھے جو ان کی تخلیقی اور جدت پسند طبیعت کے غماز تھے کہ عام طور پر لوگ اپنے کارٹون چھپا کر رکھا کرتے ہیں۔گلوکار جگجیت سنگھ سے طے کیا تھا کہ وہ بھی گلزار کی طرف آ جائیں گے تاکہ اسی بہانے ملاقات کے ساتھ ساتھ مجوزہ سی ڈی کے لیے کلام کا انتخاب بھی کیا جا سکے ان کا فون آیا کہ وہ کچھ غیر متوقع مہمانوں کی وجہ سے پھنس گئے ہیں اور کوئی دو بجے تک پہنچ سکیں گے۔ دوسری طرف امیتابھ بچن کی سیکرٹری رابطے میں تھی کہ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوگی اور چونکہ مجوزہ وقت Clash کر رہا تھا اس لیے یہی طے پایا کہ جگجیت سنگھ گلزار صاحب کے مشورے سے کلام کا انتخاب کرلیں گے اور بعد میں فون اور فیکس پر ''ایجاب وقبول'' ہوجائے گا۔

امیتابھ بچن گزشتہ تیس برس سے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ چلے آرہے ہیں۔ان سے پہلے دلیپ کمار اور بعد میں شاہ رخ خان نے بھی اس میدان میں بہت نام کمایا اور اپنی اپنی جگہ پر یقیناً انہیں بھی بے مثال کہا جا سکتا ہے مگر شاید امیتابھ پر قسمت کچھ زیادہ مہربان ہے کہ بطور کریکٹر ایکٹر بھی وہ فلم کی باقی ساری کاسٹ پر بھاری پڑتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان سے ملاقات ساڑھے تین بجے فلم ''ضمانت'' کی لوکیشن پر ہوگی جس کی شوٹنگ گزشتہ بارہ برس سے رک رک کر ہورہی ہے کہ فلم کے ہدایت کار وجے ناتھن اپنے پروڈیوسرز کی وجہ سے اسے مکمل نہیں کر پا رہے لیکن اس کے باوجود امیتابھ ان کے کام کو افضلیت دیتے ہیں کیونکہ وجے ناتھن نے ان کی گمنامی اور کشمکش کے دور میں انہیں ہیرو لیا تھا اور وہ یہ احسان بھول نہیں سکتے۔گلزار نے بتایا کہ اس دولت زدہ انڈسٹری میں یہ غیر معمولی انسانی رویہ شاید امیتابھ کے والدین کی عمدہ تربیت کے باعث ہے اور خوش کن بات یہ ہے کہ یہ تربیت ان کے بچوں میں بھی منتقل ہورہی ہے۔

امیتابھ شوٹنگ کی لوکیشن پر اپنی مخصوص لگژری کوچ استعمال کرتے ہیں (جس میں ان کا بیڈروم، میک اپ روم اور باتھ روم وغیرہ

خاص طور پر بنائے گئے ہیں) ہماری ملاقات یہیں ہوئی تاکہ آسانی اور یکسوئی سے بات چیت ہو سکے۔ پاکستانی ٹی وی اور فلم کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں اور اردو سکرپٹ بھی چونکہ وہ آسانی سے پڑھ نہیں سکتے سو پاکستانی شاعری کا بھی انہیں کوئی خاص پتہ نہیں تھا لیکن جس قدر محبت اور اخلاق سے ملے اور جس توجہ اور انہماک سے انہوں نے گفتگو میں حصہ لیا اس کا بیشتر کریڈٹ تو یقیناً گلزار ہی کو جاتا ہے کہ اصل میں وہ ہماری وساطت سے ان کی عزت کر رہے تھے جو ان کی خاندانی اور شخصی شرافت اور وضع داری کی آئینہ دار تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مخاطب کی بات کو غور سے سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے فن سے متعلق ہر اچھی یا نئی بات کو Pick کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جب میں نے ان کی حالیہ فلم ''بلیک'' کے ایک سین میں ان کی ڈائیلاگ ڈلیوری کے ایک مخصوص پہلو کا ذکر کیا تو نہ صرف ان کی آنکھیں چمک اٹھیں بلکہ انہوں نے مختلف سوالات کر کے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کی اور دوبارہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ آپ اب تک ملنے والے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اتنی باریکی اور تفصیل سے یہ بات نوٹ کی ہے۔ اس پر گلزار کچھ اس محبت اور بے ساختگی سے مسکرائے جو صرف ان مخلص دوستوں کو ہی نصیب ہو سکتی ہے جو اپنے دوستوں کی عزت تعریف اور ترقی پر خوش ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سلیم عارف نے اس موقع پر اپنے Digital کیمرے سے بہت سی تصویریں بنائیں۔ فردوس اس ملاقات سے بہت خوش اور Excited تھی جس پر بعد میں گلزار نے ہنسی ہنسی میں اسے خوب تنگ کیا۔

باہر نکلے تو انوپم کھیر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے ہمیں اپنے موبائل پر آیا ہوا ایک ایس ایم ایس میسج دکھایا جو اس کے کسی پرستار نے ہولی کی مبارکباد کے سلسلے میں گلزار کے مخصوص سٹائل میں لکھا تھا۔ ہماری فلائیٹ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا سو بات سلام دعا تک ہی محدود رہی۔ واپسی پر ہم نے جلدی جلدی بیٹے علی ذیشان اور کچھ احباب کے لیے گلزار کے ہمسائے میں واقع ایک سٹور سے کچھ مردانہ قمیضیں اور نواسیوں کے لیے کچھ کپڑے خریدے اور ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ گلزار کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے چیک ان ہونے تک ہمارے ساتھ ہی رہیں گے حالانکہ میں نے انہیں کہا بھی کہ ہمارا فی الحال واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔ اسی طرح کی دلچسپ باتوں میں فلائٹ کا ٹائم ہو گیا۔ فلائٹ موسم کی خرابی کی وجہ سے خاصی ناہموار تھی چنانچہ دلی ائیر پورٹ پر اترتے وقت ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے ہم آئے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں۔

اگلا دن عازم کوہلی کی فیملی کے ساتھ گڑگاؤں کی سیر میں اور شام اجیتا اروڑہ کے گھر ایک نیم ادبی محفل میں گزری اور ایک بار پھر یہ تاثر پختہ ہوا کہ وہاں کے اہل ثروت میں زیادہ تعداد مہذب، تعلیم یافتہ اور سادگی پسند لوگوں کی ہے جو دولت سے زیادہ اپنی شخصیت کو

وجہ اعزاز سمجھتے ہیں۔ دلی سے لاہور آتے ہوئے جہاز میں نوجوان کرکٹروں یاسر حمید' توفیق عمر اور خلیل احمد سے ملاقات ہوئی جو ون ڈے سیریز میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے واپس جارہے تھے۔ ان نوجوانوں سے بات کر کے خوشی ہوئی کہ شوخ طبع اور کھلاڑی ہونے کے باوجود ان کی نشست و برخاست اور بات چیت کا انداز بہت سلجھا ہوا تھا' سوانہیں دیکھ کر احمد مشتاق کا یہ شعر بہت یاد آیا کہ

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

بھارت میں اردو کا مستقبل

گزشتہ برس دلی کے ND ٹی وی چینل پر ایک لائیو انٹرویو کے دوران بھارت کے دور دراز کے علاقوں سے پانچ افراد نے مجھ سے بذریعہ فون بات کی۔ اتفاق سے یہ پانچوں کے پانچوں مسلمان تھے اور کم وبیش ہر ایک کی گفتگو میں یہ تلخ سوال شامل تھا کہ آپ پاکستانی لوگ ہم ہندوستانی مسلمانوں کو چین سے کیوں جینے نہیں دیتے۔ آپ سے اپنے ملک کے مسلمان تو سنبھالے نہیں جاتے تو پھر کیوں ہماری بقا اور فلاح کا مروڑ آپ کے پیٹ میں اٹھ اٹھ کر ہمارے مسائل میں اضافہ کرتا رہتا ہے؟

ان احباب کے لہجے کی تلخی' گفتگو کا انداز اور احتجاجی رویہ میرے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔ اس وقت تو میں نے کسی نہ کسی طرح معاملہ سنبھال لیا لیکن سچی بات ہے کہ اندر سے میں بہت پریشان ہوا کہ پاکستانی عوام کی محبت' خیر سگالی اور اسلامی اخوت کے جذبات کو سراہنے کی بجائے یہ لوگ ''ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو'' کے نعرے کیوں لگا رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد جب اس سوال کا کچھ جواب سمجھ میں آیا تو مزید پریشانی ہوئی۔

اب جو میں نے بھارت میں اردو کے مستقبل کے بارے میں بات شروع کی تو ایک بار پھر اسی انٹرویو کی سی صورت حال پیدا ہو گئی اور کوئی میرے اندر سے پوچھ رہا تھا کہ بھارت میں تو اردو مقبوضہ کشمیر کے علاوہ کسی صوبے کی سرکاری زبان نہیں سو اگر وہاں اسے مختلف مسائل کا سامنا ہے تو اس کی کچھ غور طلب اور پیچیدہ وجوہات بھی ہیں۔ پاکستان کی تو یہ قومی زبان ہے جسے آئین کے مطابق ۱۹۸۸ء تک سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا تھا۔۔۔۔۔۔۔ کیا یہاں اس کا مستقبل محفوظ ہے؟

بھارت میں اردو کم وبیش ہر علاقے میں کسی نہ کسی حد تک بولی اور سمجھی جاتی ہے' سرکاری سطح پر اسے لاکھ ہندی کہا جائے لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کا جو روپ عوام کی زبان پر ہے وہ اپنی اصل میں اردو ہی ہے۔ مقامی لہجوں کے اثرات کے باعث اس کی بول چال کا انداز بھلے ہی مختلف ہو' بے شک کہیں ق کو خ' ش کو س' خ کو کھ اور ج کو ذ بولا جائے اور زبان اور گرامر کے اعتبار سے بیشتر

جملے کانوں پر گراں گزریں لیکن بھارت کے طول وعرض میں اب بھی مقامی زبانوں میں اردو ہی سب سے زیادہ مقبول اور مستعمل زبان ہے۔ سو خطرہ بول چال کی اردو کو نہیں اس کے فارسی سکرپٹ کو ہے جو تیزی سے غائب ہو رہا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک مشاعرے میں دس ہزار لوگ اردو شاعری پر سر دھن رہے ہوتے ہیں لیکن ان میں سے بمشکل پانچ فیصد اس کلام کو اردو سکرپٹ میں پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ تعداد روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

معلوم ہوا کہ اس کی زیادہ تر ذمہ داری خود بھارتی مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے کہ نہ صرف وہ اپنے بچوں کو اردو سکولوں میں داخل کرواتے اور انہیں اردو بطور مضمون نہیں پڑھواتے بلکہ مردم شماری کے موقع پر اپنی مادری زبان بھی اردو نہیں لکھواتے جس کی وجہ سے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اردو قومی ترجیحات اور مالی سرپرستی کے حوالے سے کسی شمار قطار میں نہیں آتی۔ عام تصور یہ ہے کہ اس کی وجہ اردو کا روزی روٹی کے معاملات سے عدم تعلق ہے اور اس وقت سب سے برا حال یو پی، سی پی اور بہار کا ہے جہاں سے اردو کو مکمل دیس نکالا مل چکا ہے۔ حالانکہ پاکستان میں انہی علاقوں کے لوگ عمومی طور پر اہل زبان کہلاتے ہیں فی الوقت اردو صرف تین صوبوں یعنی آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک میں قدرے بہتر حالت میں ہے اور یاد رہے کہ یہ تینوں صوبے ساؤتھ یعنی جنوب سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ روایتی طور پر اردو کا گڑھ دہلی اور لکھنو کو سمجھا جاتا تھا۔ پاکستان میں یہاں کی اردوئے معلی کی جگہ اردوئے محلہ نے لے لی ہے اور دیگر اہم پاکستانی زبانوں پنجابی، سرائیکی، سندھی، پشتو اور بلوچی کے تال میل سے اس کا ذخیرۂ الفاظ نہ صرف بڑھا ہے بلکہ اس میں ان زبانوں کے کلچر کی قوت بھی شامل ہو گئی ہے جس نے اس کا درجہ رابطے کی زبان سے کہیں زیادہ بلند کر کے اسے محبت اور اخوت کی زبان بنا دیا ہے اور بیورو کریسی کی انگریزی زدگی اور حکومتوں کی منافقانہ پالیسیوں کے باوجود اس میں وہ کشش پیدا کر دی ہے کہ آج خیبر سے کراچی تک ہر پاکستانی اپنے بچے سے اردو میں بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بات بھارت میں اردو سکرپٹ کی ہو رہی تھی، میرے اندازے کے مطابق ۵۰ سال کی عمر سے کم کے اسی فیصد وہ لوگ جن کے والدین اردو سکرپٹ پڑھ سکتے تھے اب شاید اپنا نام بھی اردو میں بمشکل لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ چند برس پہلے جب عصمت چغتائی پاکستان آئی تھیں تو ان کے منہ سے یہ بات سن کر بہت افسوس آمیز حیرت ہوئی کہ ان کی اپنی بیٹیاں ان کی کتابیں اردو میں نہیں پڑھ سکتیں لیکن اب تو یہ معاملہ بیشتر اردو لکھنے والوں کا مشترکہ المیہ ہے اور اگر حالات ایسے ہی رہے تو آئندہ پندرہ بیس برسوں میں یہ تعداد سو فی صد بھی ہو سکتی ہے۔

انمول ہوٹل حیدر آباد کی لابی میں اس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی کہ اگر کیفی اعظمی کی بیٹی شبانہ اعظمی رومن میں اردو پڑھتی اور لکھتی ہے

توکل کو جاوید اختر کے بچے بھی اپنی مادری زبان ہی اپنائیں گے اور یوں ہندوستان کے اردو دان طبقے کی آئندہ نسل کے لیے اردو کی کتابیں اور لائبریریاں عجائب گھروں میں رکھے نوادرات کی شکل اختیار کر جائیں گی جن کا وجود صرف انہیں دیکھنے کی حد تک محدود ہوتا ہے محفل میں موجود کسی شخص نے یکدم سوال کیا کہ پاکستان کی نئی نسل اردو سکرپٹ سے کس حد تک جڑی ہوئی ہے وہاں تو یقینا سب خواندہ نوجوان اردو فر فر پڑھتے ہوں گے۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ اثبات میں سر ہلا کر اس بات کو ٹال دیں مگر جب دھیان اپنے انگلش میڈیم سکول اور اے لیول اور او لیول کے بڑھتے ہوئے تعلیمی سسٹم کی طرف گیا تو زبان میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔ جن تعلیمی اداروں میں انگریزی کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان میں بات کرنے پر طالب علم کو جرمانہ کیا جاتا ہو اور جہاں سے مستقبل کے حاکم طبقوں نے تربیت پا کر یورپ اور امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہو اگر ان کے آٹھ آٹھ کنال کے گھروں میں اردو کی ایک بھی کتاب نہ پائی جاتی ہو تو وہ نسل بھارت کی نوجوان نسل سے کم از کم اردو زبان کی حد تک کیسے مختلف ہوگی۔ اس کا کوئی جواب میرے پاس نہ اس وقت تھا اور نہ اب ہے۔ سو میں نے اقرار جرم کے سے انداز میں کچھ کہا ضرور' مگر بعد میں رات دیر تک اپنے کمرے میں لیٹا یہی سوچتا رہا کہ کیا واقعی بھارت میں اردو کے مستقبل پر پڑنے والے تاریک سائے صرف بھارت تک ہی محدود ہیں؟

حیدر آباد دکن میں اردو میلہ

روزنامہ ''سیاست'' حیدر آباد دکن کا برصغیر کی اردو صحافت میں کم و بیش وہی مقام ہے جو مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار'' کا تھا کہ دونوں اپنے اپنے وقت اور دائرہ کار میں مسلمانوں اور اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے نمائندہ اور ترجمان ہیں اور تھے۔ دونوں ملکوں میں اخبارات اور رسائل کی آمد و رفت اور فراہمی میں جو دشواریاں رہی ہیں ان کے باعث کچھ عرصہ پہلے تک میں نے ''سیاست'' اخبار تو نہیں دیکھا تھا لیکن بھارت کے نامور مزاح نگار میرے دوست اور ابراہیم جلیس کے برادر خورد مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے توسط سے میرا اس کا تعارف بہت پرانا ہے کہ مجتبیٰ کو ''سیاست'' میں ہفتہ وار کالم لکھتے ایک عمر ہو گئی ہے اور ان کے کئی مجموعے کتابی شکل میں بھی شائع ہو کر دونوں ملکوں میں اپنے قارئین کا ایک بہت بڑا حلقہ پیدا کر چکے ہیں۔

سو دو برس قبل نیویارک میں جب میری پہلی ملاقات ''سیاست'' کے ایڈیٹر زاہد علی خان سے ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں' ہم دونوں وہاں ''اردو کی نئی بستیاں'' کے زیر عنوان ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس کے مندوبین تھے' ہمارے دوست تقی عابدی' خلیل الرحمن' عبدالرحمن اور وکیل انصاری نے کانفرنس کا پروگرام کچھ ایسی ''باریک بینی'' سے ترتیب دیا تھا کہ اس میں سے شخص یعنی براہ راست ملاقات اور بات چیت کے لیے وقت نکالنا قریب قریب ناممکن تھا اس پر فلائٹ کی تاخیر کے

باعث زاہد علی خان پہنچے بھی اپنا سیشن شروع ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے۔ انہوں نے اپنے اخبارات اور بھارت کی اردو صحافت کے حوالے سے پروجیکٹر کے توسط سے ایک بہت اچھی Presentation دی' جس سے اندازہ ہوا کہ وہ جدید زمانے اور صحافت کے نئے پرانے تقاضوں سے بہت اچھی طرح باخبر ہیں۔

بعد میں گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ عنقریب اپنے ادارے کے تحت ایسی ہی ایک کانفرنس حیدر آباد دکن میں منعقد کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں جس میں آپ کو شرکت کی دعوت ابھی سے دی جا رہی ہے اس وقت تو میں نے اس دعوت کو خیر سگالی کا ایک رسمی پیغام ہی سمجھا لیکن جب چند ماہ قبل ان کی طرف سے اطلاعات آنا شروع ہوئیں اور پھر باقاعدہ دعوت نامہ آن پہنچا تو احساس ہوا کہ بعض اوقات رواداری میں کئے ہوئے وعدے کس طرح کمٹمنٹ کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ کانفرنس ۱۸ تا ۲۰ نومبر ۲۰۰۵ء کو ہونا تھی مگر اس سے پہلے آٹھ اکتوبر کو زلزلہ آ گیا جس کی تباہ کاری کے پھیلاؤ اور ذہنی افسردگی اور غیر حاضری کے باعث پاکستان سے ہم لوگوں کی شمولیت ممکن نہ رہی۔

زاہد علی خان چاہتے تو حسب پروگرام اس کا انعقاد کر سکتے تھے کہ باقی ساری اردو دنیا کے مندوبین اپنی شمولیت اور رضامندی کا اقرار اور اظہار کر چکے تھے مگر انہوں نے انسانی ہمدردی اور پاکستانی احباب سے اپنی محبت کے تحت کانفرنس تین ماہ کے لیے ملتوی کر دی جو اب ۱۴ تا ۱۶ جنوری کو منعقد ہو رہی ہے جس میں میری اطلاعات کے مطابق جمیل الدین عالی' انتظار حسین' ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر پیرزادہ قاسم' حمایت علی شاعر' نصیر ترابی' افتخار عارف اور مجھے مدعو کیا گیا ہے ابھی ابھی کانفرنس کے معتمد عمومی علامہ اعجاز فرخ نے فون پر بتایا کہ عالی صاحب بوجہ علالت اور انتظار حسین اور نصیر ترابی کچھ ذاتی مصروفیات کے باعث تشریف نہیں لا رہے اور ان کی جگہ افسانہ نگار ناصر بغدادی آ رہے ہیں۔

تاریخ' تہذیب اور ادب کے حوالے سے حیدر آباد اپنے اندر ایک مخصوص کشش رکھتا ہے۔ دلی' لکھنؤ' آگرہ' جے پور سمیت یہ ان پانچ بھارتی شہروں میں سے ہے جو اپنی مختلف خوبیوں کے باعث مجھے محبوب رہے ہیں اور جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہمیشہ میری خواہشوں کی فہرست میں شامل رہا ہے۔ (زندگی رہی تو لکھنؤ اور جے پور بھی دیکھ لیں گے) میرے دوست ڈاکٹر سید تقی عابدی جو رثائی ادب پر تخلیقی کام کے حوالے سے پوری اردو دنیا میں مشہور ہیں اور آج کل کینیڈا میں رہتے ہیں اصلی اور پکے حیدر آبادی ہیں انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر بھی مجھے حیدر آباد زیادہ اچھا لگنے لگا ہے کہ شہروں کی پہچان سنگ و خشت سے نہیں اس کے باسیوں سے ہوا کرتی ہے۔ تقی گزشتہ پچیس برس سے انگریزی بولنے والے ملکوں میں رہائش پذیر ہیں مگر ان کی فکر' مشاغل' لباس' گفتگو سب کے

سب خالص دیسی بلکہ حیدرآبادی ہیں اگرچہ وہ عام حیدرآبادیوں کی طرح ''ق'' کو باقاعدہ ''خ'' نہیں بولتے مگر ان کے لہجے میں حیدرآبادی چاشنی چھلک چھلک پڑتی ہے ان کی بیگم ایران سے ہیں سو جب فارسی محاورہ اور اس کی تراکیب کا استعمال اس میں جمع ہوتا ہے تو دوآتشہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

پروگرام کے مطابق مجھے بارہ کی شام کو لاہور سے دلی اور تیرہ کی شام کو دہلی سے حیدرآباد پہنچنا ہے۔ دہلی سے حیدرآباد کی فلائٹ میں تقی عابدی اور گروندر سنگھ کوہلی عازم ہم سفر ہوں گے۔ علامہ اعجاز فرخ کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق بھارت کے صف اول کے اردو لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس کانفرنس میں شرکت کر رہی ہے اور اس کے تمام اجلاس ۵۲ ملکوں میں اردو چینل کے ذریعے براہ راست ٹیلی کاسٹ ہوں گے اس سے مجھے خیال آیا کہ ہم نے بھی (دنیا کو دکھانے کے لیے ہی سہی) اردو کو اپنی قومی زبان مشہور کر رکھا ہے لیکن ہماری اکادمی ادبیات کو برسوں میں بین الاقوامی تو کیا کوئی قومی کانفرنس منعقد کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی جبکہ بھارت میں حکومت کی مبینہ اردو دشمنی کے باوجود ایک اردو اخبار اپنے محدود ذرائع کے ساتھ ایسی بڑی کانفرنس کا اہتمام کر رہا ہے۔

ہم ''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' کی آٹھ کالمی سرخی لگا کر اپنی خوبصورت محبت کرنے والی اور اردو دوست پاکستانی زبانوں سے تو خواہ مخواہ کی محاذ آرائی کر سکتے ہیں لیکن اس سے ہماری کمٹمنٹ کا یہ عالم ہے کہ آج کل مجھے جتنے بھی شادی کارڈ وصول ہوتے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی اردو میں ہوتا ہو اور مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ اس میں اردو کا اہل زبان ہونے' اس سے روزی کمانے اور اس کے نام پر اپنی سیاست چمکانے والے سب کے سب برابر کے شریک ہیں۔

آیئے اردو سے محبت اور اس کی عزت کرنا سیکھیں کہ آج تک دنیا میں کسی قوم نے کسی دوسری قوم کی زبان میں ترقی نہیں کی۔ حیدرآباد کی یہ اردو کانفرنس ہمیں اس پر سوچنے کا ایک اور موقع مہیا کر رہی ہے۔

ریاستی کلچر

یہ عجیب بات ہے کہ رجواڑوں اور ریاستوں کو ختم ہوئے اب تقریباً ۵۸ برس ہو چلے ہیں لیکن یہاں کے بیشتر رہنے والے اب بھی ریاستی دور' اس کی یادوں' یادگاروں اور حکمرانوں کو سینے سے لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تجربہ مجھے پاکستان میں بہاولپور کے احباب سے مل کر بھی ہوا تھا اور اب حیدرآباد دکن میں ایک بار پھر اس کی تجدید ہوئی ہے کہ وہاں لوگ بات بات پر ''حضور نظام'' کا ذکر اس طرح کرتے تھے جیسے وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہوں۔ یوں تو پرانا حیدرآباد شہر پورے کا پورا اس ریاستی کلچر کا نمونہ ہے جو اس کی آب و ہوا' بام و در' بول چال اور ملبوسات سے عبارت ہے کہ جدید زمانہ کی ایجادات' طرز تعمیر' آداب خورد و نوش اور لسانی پھیلاؤ کے

باوجود یہاں کی پرانی نسل' خصوصاً مسلمان سب کچھ بدل جانے کے بعد بھی ابھی تک اپنے Nostalgia سے باہر نہیں نکلے۔ حیرت کی بات ہے کہ قطب شاہی زمانے سے لے کر سقوط حیدرآباد تک چارسو برسوں میں حیدرآباد کی مسلم آبادی ہمیشہ اقلیت ہی میں رہی ہے جو اپنی جگہ پر مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور انصاف پسندی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے یہاں تک کہ مالی اور معاشی حوالوں سے بھی ریاستی عہدیداروں اور مقربین کی ایک قلیل تعداد سے قطع نظر یہاں کی مسلمان آبادی دوسرے اور تیسرے درجے کی حامل ہی رہی ہے اور اب تو یہ وہاں کا سب سے پسماندہ طبقہ ہے کہ حیدرآباد کے کم وبیش نوے فیصد مسلمان غربت سے نیچے کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں مذہبی نوعیت کی عمارات ہوں یا بازار زیادہ تر بھکاری اور دیہاڑی دار مزدور آپ کو مسلمان ہی نظر آئیں گے۔

میں نے وہاں کے چند احباب سے اس کی وجہ دریافت کی تو ''وجوہات'' کا ایک ہجوم جمع ہو گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ عام تاثر سے قطع نظر کہ یہ حکومت کی مسلمان دشمن پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ بھارتی مسلمان اپنے زوال اور پسماندگی کے بہت حد تک خود ذمہ دار ہیں اور کم وبیش یہی صورت حال اردو زبان کے ساتھ بھی ہے جب اردو بولنے والے اپنی زبان سے خود دستبردار ہو جائیں اور اپنے بچوں کو اردو میڈیم کے بجائے انگریزی اور ہندی یا مقامی زبان تیلگو میں تعلیم دلوائیں تو پھر حکومت اپنے طور پر اردو کی حفاظت کیوں اور کیسے کرے۔

اردو کی معروف اور مستند ادیبہ جیلانی بانو اور ان کے شوہر انور معظم حیدرآباد ہی میں رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا بھی وطن مالوف ہے لیکن ان کے بعد کی نسل میں کوئی ایسا لکھنے والا نظر نہیں آتا جس کا نام کسی تحفظ کے بغیر لیا جا سکے۔ جیلانی بانو کے گھر سے گولکنڈہ کا تاریخی قلعہ صاف نظر آتا ہے جس کے ماحول میں تو یقیناً سانس لے رہی ہے مگر اب اس کے اردگرد وہ حیدرآباد پھیل رہا ہے جسے اس کے سابق وزیر اعلیٰ چندرا بابو نائیڈو نے ''سائبر آباد'' بنانے کا دعویٰ کیا تھا البتہ ایک قدیم روایت کا پالن انہوں نے بھی نہیں کیا کہ سلاطین اور دیگر حکمرانوں کی طرح وہ بھی ایک مخصوص نوع کی بغاوت کے ذریعے اقتدار میں آئے تھے۔ بتایا گیا کہ ان کے سسر این ٹی' راماراؤ تیلگو فلموں کے مشہور ہیرو ہونے کے ساتھ ساتھ آندھرا پردیش کے انتہائی مقبول وزیر اعلیٰ بھی تھے اور تیلگو دیشم پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ چندرا بابو نائیڈو نے بڑی صفائی سے ان کی حکومت کا تختہ الٹا اور اقتدار پر قابض ہو گئے مگر جب اس دوران میں راماراؤ کا انتقال ہو گیا تو اگلے الیکشن میں اس نے ان کی تصویر اٹھا کر ان کے نام پر ایسی مہم چلائی کہ دوبارہ برسر اقتدار آ گئے۔ یہاں تک کہ گزشتہ انتخاب میں انہیں کانگریسی لیڈر ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی نے شکست دی۔ بھارتی سیاست کی ایک بات البتہ خصوصیت سے قابل تعریف ہے کہ جس عالمی اردو کانفرنس کے حوالے سے میں گزشتہ ہفتے حیدرآباد گیا تھا اس کے افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی موجودہ وزیر اعلیٰ تھے اور اسی کانفرنس کے زیر اہتمام شام کو ہونے والے مشاعرے میں یہ

اعزاز سابق وزیر اعلیٰ چندرا بابو کو دیا گیا۔ کاش ہمارے سیاست دانوں میں بھی اتنی وسعت نظر پیدا ہو سکے کہ وہ انتخابی مخالفین کو ''خاندانی دشمن'' سمجھنا چھوڑ دیں۔

کانفرنس کے منتظمین زیادہ تر طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے سوان کے گھر، لباس اور معاشرتی مقام واضح طور پر بقیہ حاضرین سے مختلف تھے اور دراصل یہی لوگ تھے جنہیں ریاستی کلچر کی یادگار کہا جا سکتا ہے۔ ''سیاست'' اخبار جو بھارت کا سب سے بڑا اردو اخبار ہے، کے ایڈیٹر زاہد علی خان اور ان کے احباب کی گفتگو میں ''حضور نظام'' کا ذکر اب بھی مختلف حوالوں سے نمایاں ہوتا رہتا ہے یہ اور بات ہے کہ اردو کانفرنس سے متعلق دوسری شام کو ہونے والی ''شام غزل'' میں گانے والوں اور والیوں کی نشست عین اس جگہ رکھی گئی جہاں نظام اپنے دور اقتدار میں خود ''تشریفاں'' رکھا کرتے تھے اور ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا سوئے ادب سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں وہاں ''نظام جیولری'' کی نمائش مشہور ''سالار جنگ میوزیم'' میں جاری تھی جو اپنی جگہ پر ایک الگ موضوع ہے سو اس کے بارے میں گفتگو اگلے کالم میں ہوگی۔

سالار جنگ میوزیم اور نظام شاہی زیورات

حیدر آباد کے آخری نظام میر عثمان علی کی دولت اور کنجوسی کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ سقوط حیدر آباد کے بعد ان کے روز و شب کیسے گزرے۔ اس کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں لیکن ان کی حکومت کے زمانے کی داستانیں قدم قدم پر آپ کا راستہ روکتی ہیں اردو کانفرنس جس ہال میں ہوئی وہ جوبلی ہال کہلاتا ہے جس کے ارد گرد ذیلی عمارتوں اور گھاس کے قطعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے اور اب یہ علاقہ پبلک گارڈن کہلاتا ہے۔ سالار جنگ میوزیم کے بارے میں کچھ معلومات تو مجھے تھیں لیکن ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد جس بھی میزبان سے بات ہوئی اس نے یہ ضرور کہا کہ اگر آپ نے سالار جنگ میوزیم نہیں دیکھا تو یوں سمجھئے کہ آپ حیدر آباد آئے ہی نہیں۔

منتظمین نے اپنے پروگرام میں ۱۷ جنوری کا دن غیر ملکی مندوبین کو حیدر آباد کی سیر کرانے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا مگر ۱۶ کی شام تک کسی نے بھی اس ضمن میں مہمانوں سے رابطہ نہیں کیا کانفرنس کے معاون صدر علامہ اعجاز فرخ کئی بار نظر تو آئے مگر ان کے انداز و اطوار ہم سے زیادہ مہمانوں والے تھے کہ ہر بار ان سے مل کر غالب کا ایک شاعر یاد آ جاتا تھا۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے

برادرم سید تقی عابدی کی کینیڈا سے حیدر آباد کی طویل فلائیٹ میں پیرس کی مطلوبہ اور منسلکہ فلائیٹ چھوٹ گئی سو وہ کانفرنس کے ابتدائی سیشن کے آغاز سے چند گھنٹے قبل علی الصبح چار بجے حیدر آباد پہنچے۔ ۳۶ گھنٹے کے سفر کی تھکن کی وجہ سے ان کی حالت حیدر آبادی لہجے میں اس ''خابل'' نہیں تھی کہ ان سے اس موضوع پر بات کی جاتی کیونکہ مذکورہ دن کے انتظامات انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے جب انہیں چیزیں ٹھیک سے نظر آنا شروع ہوئیں تو کانفرنس کے اجلاس شروع ہو چکے تھے۔ پہلے دن چار اجلاس اور شام کو مشاعرہ تھا اور دوسرے دن بھی چار اجلاس اور شام کو''شام غزل'' تھی سو اس مت مارنے والی مصروفیت میں سالار جنگ تو کیا ان کے مربی حضور نظام کے لیے بھی وقت نکالنا ممکن نہیں تھا۔

سولہ جنوری کا دن بھی تین باقاعدہ اور ایک اختتامی اجلاس پر مشتمل تھا جو حیدر آباد کے ایک ٹی وی چینل سے براہ راست نشر ہونا تھا جو بھارت میں اردو کا واحد چینل تھا اور جس کے نمائندے بڑی مستعدی سے نہ صرف اس پوری کانفرنس کو ریکارڈ کر رہے تھے بلکہ مندوبین سے ہر سیشن کے بارے میں ان کے تاثرات بھی فلم بند کر کے روزانہ شام کو ایک سپیشل رپورٹ میں دکھاتے تھے۔ اس دن دوپہر کو مجتبیٰ حسین اور ان کے شکاگو کے دوست قادری صاحب ہم سب کو سکندر آباد کے ایرانی ہوٹل میں لنچ کے لیے لے گئے۔ معلوم ہوا کہ حیدر آباد پھیل کر یا سکندر آباد سمٹ کر اب اس طرح یکجان ہو چکے ہیں کہ ان کے درمیان حد تفریق کم از کم ہمیں تو نظر نہیں آئی۔ لنچ کے دوران منتظمین کی بد انتظامی کے مختلف پہلو موضوع گفتگو رہے لیکن مجموعی تاثر یہی تھا کہ جیسی بھی ہے اس کانفرنس کا ہو جانا ہی اردو کے لیے بہت اہم اور ضروری تھا۔

تقی عابدی کے برادر خورد اصغر اور بڑے بھائی عسکری صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اصغر سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں اور عسکری حیدر آباد میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے بہت سے تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں۔ مجھے دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اور ان کی گفتگو سن کر بہت مزا آیا کہ یہ سچ مچ شعلہ و شبنم کا ملاپ تھا۔ تقی جتنے مرتب آدمی ہیں ان کے برادر بزرگ اتنے ہی عملی اور برق رفتار ہیں۔ ان کی قوت فیصلہ کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ قسمت واقعی بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔

منتظمین کی طرف سے حیدر آباد کی سیر کے پروگرام کے بارے میں کوئی اشارہ نہ ملنے پر طے کیا گیا کہ ہم اپنے طور پر چار مینار' مکہ مسجد' قلعہ گول کنڈہ اور گنبدوں کی یاترا کے بعد سالار جنگ میوزیم دیکھنے چلیں گے جہاں آج کل نظام کے زیورات کی نمائش بھی لگی ہوئی ہے۔ وقت کی کمی کے باعث گول کنڈہ کا قلعہ اور گنبد جنہیں حیدر آبادی لوگ ''گنبداں'' بولتے ہیں' رہ گئے ------- کیونکہ ادھر جانے کا مطلب سالار جنگ میوزیم کے دیدار سے محرومی تھی۔ سالار جنگ دراصل حیدر آباد کے وزرائے اعظم کا ایک

خطاب ہے اور جس سالار جنگ کے حوالے سے یہ میوزیم بنا ہے ان کا نمبر تیسرا ہے یعنی دو نمبر وہ بہر حال نہیں تھے۔

سید تقی عابدی اور اطلاعاتی لٹریچر کے مطابق اس عمارت کے پانچ سو کمروں میں سالار جنگ کی ذاتی جمع کی ہوئی چیزیں ڈسپلے کی گئی ہیں اور یہ دنیا بھر میں کسی فرد واحد کے حوالے سے قائم کیا گیا سب سے بڑا میوزیم ہے۔ یہاں بھی سیاحوں کے ساتھ خصوصی سلوک کیا جا رہا تھا یعنی زیورات کی نمائش کی مقامیوں کے لیے ٹکٹ پچاس روپے اور سیاحوں کے لیے پانچ سو روپے فی کس تھی۔ سالار جنگ میوزیم میں داخلے کے لیے یہ تناسب ۲۰ اور ۱۵۰ روپے تھا۔ اس کے پیچھے لوٹ مار کے علاوہ کیا منطق ہے' اسے میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ نمائش کے لیے مختص عمارت میں داخلے کے لیے تیز دھوپ میں خاصی لمبی لائن تھی اس امتحان سے گزرنے کے بعد سکیورٹی چیکنگ کا مرحلہ تھا جس سے بھارت میں قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات اس احتیاط کی شدت ایک ایسی خوفزدگی کا تاثر پیدا کرتی ہے جو یقیناً مستحسن نہیں لیکن شاید ایسا کرنا ضروری بھی ہو کہ اب انسانی احتجاج اور دہشت گردی میں بہت کم فرق رہ گیا ہے اور بدقسمتی سے انسانی معاشرے اس فرق کو گھٹانے کے بجائے بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ چلئے' اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے گی الوقت ہم نظام کے زیورات کی نمائش گاہ میں چلتے ہیں جہاں ایک اور طویل لائن ہماری منتظر ہے۔ معلوم ہوا کہ تماشائیوں کی ایک مخصوص تعداد ہی کو آدھ گھنٹے کے لیے مرکزی ہال میں بھیجا جاتا ہے تا کہ وہ توجہ اور سہولت سے ان ہیرے جواہرات کا دیدار کر سکیں جن کی قیمت اربوں روپے بتائی جاتی ہے لیکن جن کے پہننے والوں میں سے اکثر کی قبروں کے نشان بھی موجود نہیں۔ رہے نام اللہ کا!

اس ہال میں زیورات کے ساتھ نظام فیملی کی تصاویر بھی رکھی گئی ہیں۔ زیادہ تر کیمرہ تصویریں آخری نظام عثمان علی خان اور ان کے والد محبوب علی خان کے دور کی ہیں۔ پرانی داستانوں اور کہانیوں میں شہزادیوں اور ملکاؤں کے حسن کے اتنے قصے بیان کئے گئے ہیں کہ اب شعوری طور پر ان کے بارے میں یہ تصور کرنا ہی بے حد مشکل ہے کہ ان کی شکل وصورت عام خواتین جیسی ہوسکتی ہے مگر یہاں تو معاملہ اس سے بھی کہیں زیادہ دگرگوں تھا کہ نظام فیملی کی بیشتر خواتین نہ صرف کم رو بلکہ باقاعدہ بدصورت اور بے ہنگم تھیں۔ جو دو بیگمات استثنا کا درجہ رکھتی ہیں وہ سلطان ترکی کی صاحبزادیاں درشہوار اور نیلوفر تھیں جو نظام کے بیٹوں سے بیاہی گئیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ دونوں ہی کچھ عرصہ بعد اپنے شوہروں کو چھوڑ گئیں جس کی وجہ غالباً ان شہزادوں کی عیاشی اور خواتین پسندی تھی۔ ان دو خوبصورت عورتوں کے شوہروں کا ہرجائی پن تو یقیناً غور طلب ہے لیکن باقی خاندان کے مردوں کو کچھ نہ کچھ رعایت ضرور دی جاسکتی ہے۔ ایک تصویر میں نظام کی چار بیویاں ایک ساتھ کھڑی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلی بیوی تو ممکن ہے ماں باپ کی مرضی یا

شاہی خاندان کے خون کی وجہ سے لائی گئی ہو مگر بعد میں تو آنکھوں کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میری اس بات پر ممکن ہے حقوق نسواں کی علم بردار خواتین ناراض ہوں مگر اس میں مجھ سے زیادہ قصور ان داستانوں کا ہے جن میں ان بیگمات کے سامنے پریوں کو پانی بھرتے دکھایا جاتا تھا' اب پتہ نہیں یہ کیمرہ مین یا روشنی کے زاویوں کی مہربانی تھی کہ اکثر خواتین کی آنکھیں ''ہر طرف'' دیکھتی نظر آ رہی تھیں۔ جہاں تک زیورات اور ہیرے جواہرات کا تعلق ہے تو ممکن ہے یہ اس زمانے کے رواج کے وجہ سے ہو لیکن بیشتر زیورات سٹار ٹی وی کے ڈراموں کی خواتین سے مستعار معلوم ہوتے تھے جن میں سوائے بھاری پن کے کوئی خوبی نہیں تھی۔ ایک ہیرے کی قیمت چار سو کروڑ روپے بتائی گئی جس کی نقل باہر ایک سٹال پر دو سو روپے میں مل رہی تھی۔ اب اسے ہماری نالائقی کہیے کہ ہمیں دونوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا۔

سالار جنگ میوزیم کو مکمل طور پر دیکھ سکنا ہمارے ویزے کی حدود سے باہر تھا اس لیے میں نے اسے کم و بیش اس امریکن ٹورسٹ کی طرح دیکھا جس نے پیرس کے دریائے سین کو اپنی بس کی کھڑکی سے ایک نظر دیکھا اور پر اپنی ڈائری میں ''Seen'' ''یعنی'' دیکھ لیا'' لکھ کر اس فرض سے عہدہ برآ ہو گیا۔ اس میوزیم کے مختلف کمروں میں ایک نوع کی چیزیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئی ہیں اور یوں آپ یہ جان سکتے ہیں کہ مرحوم کے پاس کسی ایک شعبے سے متعلق کیا کیا نوادرات تھے۔

اس میوزیم کی سیر کے دوران مجھے سودا کا ایک شعر بار بار یاد آیا جو میرے نزدیک دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے وقعتی کا ایک بھرپور اور عدیم المثال استعارہ ہے کہ اس بہت پٹے ہوئے موضوع پر ایسا زندہ شعر شاید ہی کہیں ہو۔

دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا ''کوئی یاں ہے کہ نہیں؟''

اودھے پور کے راستے

ایک دوست نے جب یہ سنا کہ میں اودھے پور ایک مشاعرہ پڑھنے جا رہا ہوں تو بے اختیار تبصرہ کیا کہ یار یہ مشاعرے کی روایت اور ڈینگی وائرس بخار کی وبا دونوں ہی قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی علاقہ ان سے محفوظ نہیں رہا۔ ان کی اس بات سے تحریک ہوئی کہ کم از کم اودھے پور کا محل وقوع تو معلوم کر لیں کیونکہ راجستھان کے حوالے سے جس شہر کا نام فوری طور پر ذہن میں آتا ہے وہ جے پور ہی ہے۔ عزیزی سعود عثمانی نے انٹرنیٹ کے وسیلے سے جو اطلاعات حاصل کیں ان کے مطابق اودھے پور' جے پور سے کم و بیش چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور کم و بیش یہی صورت حال جودھ پور کی تھی جہاں ہمارا شاعر اور نقاد دوست ش۔ک۔ نظام رہتا

ہے لیکن سب سے اہم اطلاع یہ تھی کہ اگر اودھے پور سے بذریعہ سڑک جے پور آیا جائے تو راستے میں اجمیر پڑتا ہے جہاں خواجہ معین الدین چشتی آسودۂ خاک ہیں اور جن کے دربار کی زیارت ایک سعادت سے کم نہیں سو جب مشاعرے کے منتظم معظم علی سے پروگرام کی تفصیلات طے ہوئیں تو ہم نے دہلی اودھے پور بذریعہ ہوائی جہاز اور واپسی بذریعہ سڑک جے پور براستہ اجمیر شریف رکھی اور واپسی فلائٹ اودھے پور کے بجائے جے پور سے دہلی کی کروائی۔

مشاعرے میں پاکستان سے چار شاعر مدعو تھے احمد فراز سعود عثمانی اور مجھے لاہور سے دہلی کی فلائٹ لینا تھی اور عزیزہ عنبرین حسیب عنبر (جو برادر عزیز سحر انصاری کی صاحبزادی ہیں) کو اپنے شوہر حسیب احمد کے ہمراہ کراچی سے دہلی پہنچنا تھا جہاں بستی نظام الدین کے نواح میں واقع ہوٹل راج دوت میں ہمارے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ لاہور سے ہمارے ساتھ اسی فلائٹ پر عمران خان اور فخر زمان بھی سفر کر رہے تھے ان سے گپ شپ جاری تھی کہ ایک صاحب نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ کوئی بیس سال قبل ان سے لیہ کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے میری یادداشت کا یہ عالم ہے کہ اکثر چہرہ و نام ایک ساتھ یاد نہیں آپاتے مگر حیرت کی بات ہے کہ امتیاز رضوی صاحب کو میں نے ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے پہچان لیا۔ وہ اس وقت ریلوے کے خاصے سینئر افسر ہیں اور اسی حوالے سے کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے والد مرحوم کا کلام چھپوانا چاہتے ہیں اور جو نمونے کے چند اشعار سنائے ان کا فوری تاثر یہ تھا کہ ایسے مجموعے کو ضرور چھپنا چاہیے۔ کیسے کیسے باہنر لوگ اس دنیا سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں۔

معظم علی مصر تھے کہ ان کا بھانجا شکیل جے پور سے آ کر ہمیں ائیر پورٹ سے لے لے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ میرا دوست گروندر سنگھ کوہلی جو خود بھی ایک بہت عمدہ اور خوش گو شاعر ہے مجھے اور سعود عثمانی کو ہوٹل ''راج دوت'' پہنچا دے گا جہاں سب مہمان جمع ہو جائیں گے۔ اس سے شکیل کا کام کچھ آسان ہو جائے گا لیکن وہ مرد شریف اس بات پر اڑ رہا کہ مہمانوں کی خدمت اس کی ذمہ داری ہے۔ اب ہوا یوں کہ کراچی کی فلائٹ لیٹ ہو گئی اور شکیل میاں اپنی ناتجربہ کاری کے باعث کسی اور فلائٹ کو چیک کر کے ہوٹل واپس لوٹ گئے اور ماموں میاں کو اطلاع دے دی کہ ان کے مہمان نہیں آئے۔ ابھی معظم اس صدمے سے ہی سنبھل نہ پائے تھے کہ شکیل میاں نے ان کے ہوش یہ کہہ کر اڑا دیئے کہ احمد فراز بھی ائیر پورٹ سے باہر نہیں نکلے حالانکہ ان کی فلائٹ کو لینڈ کئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہم نے ائیر پورٹ سے نکل کر شکیل کو بتا دیا تھا کہ احمد فراز ہمارے ساتھ آئے ہیں اور اس وقت اپنا سامان لے رہے ہیں تو تم ان کو لے کر ہوٹل پہنچو ہم عازم کوہلی کے ساتھ وہیں جا رہے ہیں۔ فراز چونکہ تو اتر سے

بھارت آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے وہ غالباً کسی اور دروازے سے نکل گئے جہاں انہوں نے پہلے سے اداکار راج ببر کے سیکرٹری کو اپنے آنے کی اطلاع دے رکھی تھی۔ اس صورت حال کا سب سے مضحک پہلو یہ ہے کہ وہ نوجوان شکیل تین گھنٹے وہاں کھڑا اپنے ماموں کو پریشان کرتا رہا لیکن دونوں کی سمجھ میں یہ سامنے کی بات نہیں آئی کہ وہ ہوٹل کے استقبالیہ یا ہم سے رابطہ کرتے تاکہ مل کر فراز صاحب کی نقل وحرکت کا پتہ چلایا جاسکتا۔ جب میں نے دہلی مشاعرے کی منتظم کامنا پرشاد سے بات کی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ آپ فراز کی فکر نہ کریں۔ وہ اس وقت ''محفوظ'' ہاتھوں میں ہوگا۔ اس سارے کام میں سب سے زیادہ فائدہ موبائل فون والوں کو ہوا چونکہ چار گھنٹے تک بہت سی گھنٹیاں مسلسل بجتی رہیں۔

عنبرین اور حسیب اپنے طور پر ٹیکسی لے کر ہوٹل راج دوت پہنچ چکے تھے اور موجودہ اور درپیش صورت حال کے پیش نظر خاصے پریشان لگ رہے تھے کہ یہ دونوں کا پہلا دورۂ بھارت تھا اور محاورے کے برخلاف سر منڈوائے بغیر اولے پڑ رہے تھے۔ انہیں حوصلہ دینے کے لیے سوچا گیا کہ بستی نظام الدین کے مشہور کریم ہوٹل میں چل کر کھانا کھایا جائے۔ عازم نے اپنے گھر بیٹا بھابھی سے بات کی تو معلوم ہوا کہ سوموار کو کریم ہوٹل کا ناغہ ہوتا ہے۔ سعود عثمانی ''راج دوت'' میں پہلے بھی قیام کر چکا تھا۔ اس کی ضمانت پر طے ہوا کہ کھانا وہیں کھا لیا جائے کیونکہ ہوٹل کے مالک مسٹر کالرا کے مطابق اس کے زیادہ تر گاہک ''میاں بھائی'' یعنی مسلمان ہیں۔ ڈائننگ ہال میں جگجیت سنگھ کی غزلوں کی کوئی کیسٹ یا سی ڈی چل رہی تھی۔ اچانک اس کی گائی ہوئی میری ایک غزل ''چاند کے ساتھ کئی درد پرانے نکلے'' شروع ہوگئی۔ سروس کرنے والے سٹاف کو جب معلوم ہوا کہ اس غزل بلکہ ''گجل'' کا کوی ان کے سامنے بیٹھا ہے تو ان کی مسکراہٹیں مزید گہری ہوگئیں جس کا اثر غالباً کھانے کی کوالٹی پر بھی پڑا کہ ہر چیز گرم اور معقول تھی۔

بھارت میں چائے سے زیادہ کافی کا رواج ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ مستثنیات سے قطع نظر اچھی اور پرلطف چائے وہاں ملتی بھی کم کم ہی ہے عازم کو بلی میری طبیعت کو سمجھتا ہے چنانچہ وہ ہمیں کافی کی ایک مشہور چین بیرسٹا میں لے گیا یہ ایک چھوٹا سا کافی ہاؤس تھا جو خان مارکیٹ میں واقع تھا۔ عنبرین بھارت آنے سے پہلے بھی چائے نہیں پیتی تھی سو اس نے کوئی ملک شیک ٹائپ چیز لے لی اور ہم نے کپوچینو کافی معہ آئس کریم کا لطف اٹھایا جس نے دن بھر کی تھکن کو خاصی حد تک کم کر دیا طے پایا کہ کل صبح چونکہ ہمارے پاس بہت کم وقت ہوگا کہ بارہ بجے تک ہمیں ائیرپورٹ پہنچنا ہے اس لیے صبح صبح غالب کے مزار اور درگاہ کی حاضری سے فارغ ہو لیا جائے کہ دونوں کام اپنے اپنے حوالے سے بہت ضروری ہیں۔

اس دوران میں معظم علی پی آئی اے کے مقامی منیجر نقوی صاحب کے توسط سے فراز سے رابطے کی کوشش کرتا رہا تھا جو معلومات

ہم تک پہنچیں ان کے مطابق فراز صاحب اس سے سخت ناراض تھے کہ وہ ائیر پورٹ پر انہیں خود لینے کیوں نہیں پہنچا اور جوں جوں رات ڈھلتی جارہی تھی ان کی ناراضگی میں اضافہ ہورہا تھا۔ معظم کی کوشش تھی کہ عنبرین کا میاں حسیب، شکیل کے ساتھ موقعہ واردات پر جائے اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ حسیب کا وہاں جانا کسی حساب سے نہیں بنتا کہ ایک تو اس کی بیوی کا اجنبی شہر میں اکیلے رہنا درست نہیں اور دوسرے وہ فراز کے لیے بالکل اجنبی ہے سو اس کے جانے یا نہ جانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ بات بہت مشکل سے اس کی سمجھ میں آئی لیکن اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ شکیل، فراز صاحب کا ٹکٹ کسی نہ کسی طرح ان کو دے آیا کہ ان کا ارادہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہی رات گزارنے کا تھا۔ اس معاملے کے نمٹنے کی سب سے زیادہ خوشی شکیل کو ہوئی اور اس نے سارے دن کے فاقے اور پریشانی کے بعد کھانا کھایا۔

دہلی سے اودھے پور

بھارت میں مہنگائی کسی طور بھی پاکستان سے کم نہیں، اس کا اندازہ یوں تو قدم قدم پر ہوتا ہے مگر ''راج دوت'' ہوٹل کے ناشتے کے ریٹ دیکھ کر ایک بار پھر حیرت ہوئی کہ اگر وہاں کے نچلے متوسط طبقے کی قوت خرید واقعی اتنی ہے کہ وہ اس معیار کے ہوٹل کا عام سا ناشتہ تین سو روپے فی کس میں افورڈ کرسکتے ہیں تو اس کا اثر ان کی باقی زندگی مثلاً لباس، رہائش اور سواری وغیرہ میں کیوں نظر نہیں آتا؟ اگر یہ اس عمومی سادگی اور اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے شوبازی اور فضول خرچی سے گریز کا نتیجہ ہے جس کا ذکر میں مختلف تحریروں میں کئی بار کرچکا ہوں تو اس مہنگائی کے پیش نظر اسے اختیاری رویہ سمجھا جائے یا ان کی مجبوری۔ اور واضح رہے کہ فی الوقت بھارتی روپے کی قیمت ہمارے روپے سے تقریباً ۳۰ فیصد زیادہ ہے۔ دل میں سوچا کہ برادرم عازم کوہلی سے اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے مگر واپسی تک اس کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ انشاء اللہ اگلے سفر میں اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہوٹل والوں کی وساطت سے دو گھنٹے کے لیے ایک ٹیکسی بک کروائی گئی جس کا روٹ مزار غالب اور درگاہ سے ہوتے ہوئے ائیر پورٹ تک تھا۔ Qualis نام کی یہ بھارتی ساختہ گاڑی اتنی کشادہ ہے کہ اس میں چار پانچ آدمی اور اتنے ہی سامان کے بکس آسانی سے سما سکتے ہیں۔ ڈرائیور نے گاڑی مین سڑک پر درگاہ کو جانے والے راستے کے سامنے روک دی کیونکہ اس سے آگے کا راستہ اتنی بڑی گاڑی تو کیا رکشے کے لیے بھی کافی دشوار گزار تھا۔ غالب اکیڈمی یوں تو وہاں سے صرف سوسوا سو گز دور تھی لیکن راستے کی تنگی، دکانوں کی تجاوزات اور فقیروں کی کثرت کی وجہ سے سفر خاصا لمبا ہوگیا۔ افسوس کی بات ہے کہ دلی میں سب سے زیادہ گندگی اسی علاقے میں پائی جاتی ہے جہاں صفائی کو نصف ایمان کہنے والے انتہائی واضح اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔

غالب اکیڈمی کے نگران ڈاکٹر عقیل احمد اپنے چھوٹے سے دفتر میں بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ کمرے میں ان کی کرسی کے علاوہ کل چار کرسیوں کی جگہ تھی جن میں سے ایک پر ایک خاتون کمپیوٹر پر کسی مخطوطہ نما مسودے کو منتقل کر رہی تھی چنانچہ ایک اضافی کرسی منگوائی گئی جس سے داخلے کا دروازہ تقریباً بند ہو گیا۔ خیال آیا کہ یہاں دنیا بھر سے غالب کے شیدائی اور غالب شناس سکالرز آتے رہتے ہیں اور پھر اس کے انچارج بھی ایک پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حامل اہلکار ہیں' کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس دفتر کے لیے کوئی کشادہ اور آراستہ کمرہ مختص کیا جاتا۔ یہ دفتر تو کچھ کچھ غالب کے ایک مصرعے ''گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا'' کا سیٹ لگتا ہے۔

سلام دعا کے بعد تعارفی جملوں کے بعد جب ہم نے وقت کی کمی کی وجہ سے فوراً غالب کے مزار پر حاضری کا ارادہ ظاہر کیا (جس کے نزدیکی دروازے کی چابی غالب اکیڈمی کے پاس ہوتی ہے) تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عقیل احمد (غالباً کسی اشاراتی زبان میں) چائے کا آرڈر دے چکے ہیں۔ ہم نے کہا کہ چائے وہیں منگوا لیجئے۔ مانا کہ مرزا صاحب کا پسندیدہ مشروب کوئی اور ہے مگر ان کی مغلانہ کشادہ قلبی سے امید ہے کہ وہ اپنے عقیدت مندوں کی اس جسارت سے ناراض نہیں ہوں گے۔ مجھے یاد آیا کہ ۱۹۸۲ء میں پہلے دورۂ بھارت کے دوران غالب کے مزار پر ہمارے ساتھ حاضری دینے والوں میں اس وقت کے انچارج غالب اکیڈمی ذہین نقوی' رسالہ ''فلمی ستارے'' کے ایڈیٹر اور شاعر انیس دہلوی' واجد سحری اور ابرار کرتپوری شامل تھے۔ اول الذکر دو احباب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ واجد سحری سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ ابرار کرتپوری ملتے رہتے ہیں اور پچھلے کچھ برسوں سے نعت گو شاعر کے حوالے سے زیادہ جانے جاتے ہیں غالب کی قبر ایک خاصے بڑے اور پختہ صحن نما احاطے کے ایک کونے میں ہے جس کے قریب ان کی بیگم اور ''ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف'' والے عارف کے علاوہ ساغر نظامی کی قبریں بھی ہیں اور ایک اونچی دیوار کے پیچھے گورستان شاہی ہے جس میں خاندان مغلیہ کے بہت سے شہزادوں اور شہزادیوں کی قبریں ہیں مگر جونہی غالب کی قبر پر نگاہ پڑتی ہے باقی ہر چیز جیسے آؤٹ آف فوکس ہو جاتی ہے۔ سعود عثمانی نے اپنے ویڈیو کیمرے سے پہلے خود فلم بنائی اور پھر عنبرین کے شوہر حسیب کو اپنا اعزازی شاگرد بنا کر کیمرہ چلانے کا گر سکھایا تاکہ وہ بھی اس یادگار لمحے اور منظر کا حصہ بن سکے۔ اسی دوران ایک سفید ریش شخص کسی طرف سے ایک جھاڑو لیے آیا اور اس انداز میں ہمارے اردگرد کی زمین صاف کرنے لگا جیسے زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ

''مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو''

اسے پوچھنے' چائے پینے اور غالب کے کچھ اپنے اپنے پسندیدہ اشعار دہرانے کے بعد جب ہم واپس غالب اکیڈمی پہنچے تو معلوم ہوا کہ خواجہ حسن ثانی نظامی جو کچھ عرصہ پہلے کسی کام سے گھر سے باہر گئے ہوئے تھے اب گھر واپس پہنچ چکے ہیں اور ہمارا انتظار کر

رہے ہیں۔ان کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی صاحب نے درگاہ کے سجادہ نشینوں کے خلاف دعویٰ دائر کر رکھا ہے کہ درگاہ کا انتظام ان کے قبضے سے لے کر اسے اوقاف کی شکل دے دی جائے تاکہ نذر و نیاز اور چڑھاوے کی کثیر آمدنی ان کے درمیان بٹنے کی بجائے درگاہ اور بستی کی بہتری پر خرچ کی جاسکے۔آج اس مقدمے کی پیشی تھی جسے بھگت کر وہ آرہے تھے۔خواجہ صاحب اتنے شفیق اور سلجھے ہوئے بزرگ ہیں کہ میں باوجود خواہش کے ان سے اس موضوع پر بات نہ چھیڑ سکا البتہ انہوں نے اپنے آپ سے اس معاملے کی کچھ تفصیلات بتائیں جن پر میرا تبصرہ کرنا اس لیے نہیں بنتا کہ مجھے تفصیلی صورت حال' متعلقہ قوانین اور کیس کی ہسٹری کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اتنے بڑے بزرگ کی درگاہ کے اردگرد کا ماحول اس کی موجودہ حالت سے بہت بہتر ہونا چاہیے اور غالباً ایسا ہو بھی سکتا ہے۔

خواجہ صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہمیں ائیر پورٹ پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے تو انہوں نے چائے وغیرہ کو ہماری واپسی تک موخر کرتے ہوئے ہمیں گھر کے اندر کی طرف سے درگاہ میں جانے کے لیے کہا اور بتایا کہ ان کا بھتیجا ابھی کچھ دیر میں ہماری رہنمائی کے لیے پہنچ جائے گا کیونکہ وہ خود ٹانگوں میں تکلیف کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے قاصر ہیں۔میں چونکہ اس راستے سے پہلے بھی دو دفعہ گزر چکا تھا اس لیے خود بخود قافلہ سالار بن گیا اور سب کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔دس پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم اس دروازے تک پہنچے جو درگاہ کے اندر کی طرف کھلتا ہے تو اس میں ایک خاصا مضبوط تالا پڑا نظر آیا۔ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اس کی چابی کس سے اور کیسے مانگیں کہ ایک ملازم نما آدمی تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور اس نے بغیر چابی لگائے تالے کو دو ایک مروڑے دیئے اور تالا کھٹاک سے کھل گیا اس صاحب کرامات نے ہمیں جوتے اتار کر سیڑھیوں پر رکھنے کا مشورہ دیا اور سیڑھی کے نچلے کنارے پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو تاکید کی کہ وہ ان کا خیال رکھیں کہ ہم لوگ درگاہ کے خاص مہمان ہیں۔

سیڑھی کے بالکل سامنے چند قدم کے فاصلے پر طوطی شکر مقال امیر خسرو کا مزار تھا جو اپنے پیر و مرشد کی پائنتی میں آسودۂ خاک تھے کچھ دیر ان کے سرہانے کھڑے ہو کر دعائے مغفرت پڑھنے اور ان کی فنی عظمت کو سلام کرنے کے بعد آگے بڑھے تو ہمارے مزاروں کی روایت کے عین مطابق مانگنے والوں کا جم غفیر ساتھ ہو لیا جگہ جگہ کچھ لوگ سازوں کے ساتھ مذہبی نوعیت کے اشعار گا رہے تھے مزار کے اندر اور باہر عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔سجدہ کرتے اور مزار کو چومتے لوگ نظر آئے ان عقیدت مندوں میں ہندو مسلمان اور سکھ تینوں مذاہب کے لوگ شامل تھے اور شاید یہ بدعتیں بھی اسی مشترکہ کلچر کی دین ہیں کہ لوگوں نے ان نیک اور مقدس ہستیوں کو دیوی دیوتاؤں کا درجہ دے دیا ہے۔

اس اثنا میں خواجہ صاحب کا بھتیجا بھی پہنچ گیا جس کی وجہ سے ہمیں ہجوم میں با آسانی رستہ مل گیا اور دعا مانگنے میں سہولت ہو گئی۔ ایک مجاور نما بزرگ نے سعود کو فلم بنانے سے منع کرنے کی کوشش کی مگر جونہی اسے اندازہ ہوا کہ ہم ان کے اپنے مہمان ہیں ان کا رویہ بدل گیا اور وہ باقاعدہ سعود کی رہنمائی کرنے لگے کہ اسے کہاں کہاں کی تصویر بنانی چاہیے۔

بھارت کی پرائیویٹ ایئر لائنز بہت ترقی یافتہ ہیں اور بعض شعبوں میں تو انہوں نے سرکاری انڈین ایئر لائنز کا وہی حشر کر رکھا ہے جیسا ان کے پرائیویٹ ٹی وی چینلز نے ''دوردرشن'' کا حال کیا ہے۔ وہاں بھی مغربی ممالک کی طرح ایڈوانس بکنگ میں کرائے کی رعایت دی جاتی ہے جو بعض صورتوں میں حیرت انگیز حد تک زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارا ٹکٹ جیٹ ایئر لائنز کا تھا جس کے مسافروں کی آمدورفت کے لیے ایئر پورٹ میں ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ جس میں ایک اچھے ایئر پورٹ کی تمام سہولتیں بہت عمدہ انداز میں فراہم کی گئی تھیں۔

جیٹ ایئر لائنز کے کاؤنٹر پر چیکنگ کے دوران احمد فراز اور شہر یار بھی پہنچ گئے۔ عازم کوہلی نے ہم سب کو گپ شپ کی مہلت فراہم کرنے کے لیے سامان کی بکنگ اور بورڈنگ کارڈز کے حصول کا کام اپنے ذمہ لے لیا اور چند ہی منٹوں میں ہمیں روانگی کے لاؤنج میں پہنچا دیا۔

شہر یار علی گڑھ سے آ رہے تھے'ان سے پتہ چلا کہ مشاعرے کا اصل مقام اودھے پور نہیں بلکہ اس سے ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہندوؤں کا ایک مذہبی مقام ناتھ دوارہ ہے جہاں آج کل مذہبی سکالر مراری باپو کی رام کتھا کا پروگرام چل رہا ہے اور ہر شام کوئی نہ کوئی کلچرل پروگرام ہوتا ہے جس میں مشاعرہ بھی شامل ہے۔

اودھے پور دیکھا......نہیں دیکھا

اودھے پور کا جتنا نام سنا تھا اس کے مقابلے میں اس کا ایئر پورٹ بہت چھوٹا تھا جس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ سامان لانے والی بیلٹ پر بیک وقت پندرہ بیس سے زیادہ سوٹ کیسوں کی گنجائش نہیں تھی اور ہمارے میزبان معظم علی ہم سے بیس قدم کے فاصلے پر ہمارے منتظر تھے۔ معظم علی شاعرہ ملکہ نسیم کے شوہر ہیں جو اپنی شاعری کے لیے نہ صرف یہ کہ گلے بازی کی محتاج نہیں ہیں بلکہ اپنی بات کہنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ معظم علی نے بتایا کہ ہماری رہائش کا انتظام مقام شاعرہ یعنی ناتھ دوارہ میں ہی کیا گیا ہے جو ایئر پورٹ سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے اور یہ کہ اودھے پور کی سیر کے لیے کل کا دن مخصوص ہے۔ اگر ہمیں اس وقت اندازہ ہوتا کہ یہ وعدہ آگے چل کر وعدۂ فردا ہی ثابت ہو گا تو ہم یقیناً معظم علی سے اصرار کرتے کہ ہمیں اودھے پور میں ہی ٹھہرایا جائے

جہاں سے ہم با آسانی مشاعرے میں شرکت کے لیے ناتھ دوارہ آ جا سکتے ہیں۔

اگر چہ ہمیں سفر کے لیے بہت اچھی اور کشادہ' آرام دہ گاڑیاں فراہم کی گئی تھیں لیکن یہ شاید جہاز میں پیش کئے جانے والے کھانے کا اثر تھا کہ سعود عثمانی کی طبیعت خراب ہو گئی اور ہمیں راستے میں دو تین دفعہ رکنا پڑا تا کہ وہ کھلی ہوا میں سانس لے کر ان ابکائیوں کو روک سکے جو اسے مسلسل الٹی یعنی قے کی طرف مائل کر رہی تھیں۔ راستے کی سڑک ہماری قصباتی سڑکوں جیسی ہی تھی' بس یہ فرق تھا کہ اس کے اطراف اور درمیان میں انسانوں سے زیادہ گائیں محوخرام تھیں جو ٹریفک کو اپنی سہولت کے مطابق چلوا رہی تھیں۔ ناتھ دوارہ کے مضافات میں جگہ جگہ مراری باپو کی تصویریں نظر آنا شروع ہوئیں جن کی تعداد مسلسل بڑھتی چلی گئی اور جلسہ گاہ کے قریب تو ہر طرف ان کی تصویروں والے بینر ہی نظر آ رہے تھے جن کے ساتھ ہندی رسم الخط میں ان کے پروگرام ''رام کتھا'' کے بارے میں معلومات درج تھیں جن کا خلاصہ ہمیں منتظمین کی زبانی معلوم ہوا' جس سے اندازہ ہوا کہ مراری باپو ہندوؤں کے ڈاکٹر اسرار احمد' پروفیسر طاہر القادری اور ڈاکٹر ذاکر نائیک جیسی کوئی شخصیت ہیں جو اپنی گفتار کی سادگی علمیت اور غیر متعصبانہ سوچ کی وجہ سے بھارت کے طول وعرض میں بہت پسند کئے جاتے ہیں۔

ہمارا قیام ہوٹل گجانن میں تھا جو اس قدر شدید و بجیٹرین تھا کہ ناشتے میں انڈہ تک ممنوع تھا یعنی وہاں مرغے کی ماں کو خیر منانے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ ہوٹل خاصا بڑا اور اچھا تھا لیکن اس کے بیرونی دروازے کے باہر چھت پر لگے ہوئے فانوس کے ساتھ سیاہ رنگ کی کوئی دبیز سی جھالر نما چیز لٹک رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ شہد کی مکھیوں کا چھتہ تھا جس میں مکھیاں آزادی سے آ جا رہی تھیں۔ استقبالیہ پر موجود عملے نے بتایا کہ یہاں اسے خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اگر انہیں چھیڑا یا اس کے چھتے کے نیچے کھڑے ہو کر شراب نہ پی جائے جائے تو یہ مکھیاں کسی کو کچھ نہیں کہتیں۔ اردو شاعری میں محتسب کے بہت سے روپ بیان کئے گئے ہیں لیکن اس کا یہ شہد کی مکھیوں والا روپ احمد فراز سمیت ہم سب کے لیے بالکل نیا تھا۔

ہوٹل کے کمرے جدید اور قدیم کا خوبصورت امتزاج پیش کر رہے تھے کہ کم از کم میں نے زندگی میں پہلی بار کسی جدید انداز کے ہوٹل میں دو کواڑوں اور بڑے بڑے کنڈوں والے دروازے دیکھے۔ یہ علاقہ ماربل انڈسٹری کے لیے مشہور ہے اور غالباً یہ ہوٹل بھی ماربل کی خریداری کے لیے آنے والے تاجروں کے لیے بنایا گیا تھا ورنہ اس ویرانے میں ایسے عمدہ اور بڑے ہوٹل کی موجودگی کا کوئی اور سبب ذہن میں نہیں آتا تھا۔

رات کے کھانے پر ہر طرف سبزیاں ہی سبزیاں دیکھ کر مجھے آنجہانی جگن ناتھ آزاد بہت یاد آئے کہ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی

کی تقریبات کے حوالے سے ان کی آمد پر جب عطاء الحق قاسمی نے اپنے گھر میں ایک کھانے کا اہتمام کیا تو خاص طور پر سبزیاں اور دالیں پکوائیں تاکہ مہمان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ مہمان خصوصی ہونے کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کو سب سے پہلے کھانے کی دعوت دی گئی وہ آ کر کھانے کی میز کے سامنے کھڑے ہوئے اور ایک نظر مختلف سبزیوں اور دالوں پر ڈالی جو خاص طور پر ان کے لیے تیار کروائی گئی تھیں اور پھر مسکرا کر بولے۔

''یار اگر تم لوگوں نے یہی کچھ کھانا تھا تو پاکستان کیوں بنایا تھا؟''

جہاز میں جو اخبار پڑھنے کے لیے ملا اس کی شہ سرخی ایک خاتون پریہ درشنی کے قاتل کو سزائے موت کی خبر سے متعلق تھی جس کا تعلق کسی دولت مند گھرانے سے تھا اور اب دس برس بعد بالآخر دولت پر قانون کی فتح ہوئی۔ اخبار کی خبر سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کیس میں عوام کو بہت دلچسپی تھی اور قانون کی بالادستی کے اس اظہار کو عام طور پر بہت پسند کیا گیا تھا۔ مقتولہ کے نام سے ذہن پتہ نہیں کیوں اس طرف چلا گیا کہ بعض ناموں کے ساتھ کسی پراسرار طریقے سے کچھ باتیں منسوب ہو جاتی ہیں۔ کیا اس کے پیچھے سچ مچ کوئی معاملہ ہے یا یہ محض ایک اتفاق ہے اس پر بحث اپنی جگہ لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اس مقتولہ کے علاوہ میں اس نام کی جن دو اور عورتوں کو جانتا ہوں وہ دونوں بھی قتل کے ذریعے موت سے ہم کنار ہوئی تھیں۔ پہلی خاتون انڈین ''ہیر رانجھا'' کی ہیروئن پریہ درشنی راج ونش ہے جسے مبینہ طور پر اس کے غیر سرکاری شوہر فلم ڈائریکٹر اور دیو آنند کے بھائی چیتن آنند کی پہلی بیوی کے بچوں نے قتل کر دیا تھا اور دوسری بھارت کی سابق وزیر اعظم اور ایک عالمی شہرت کی حامل شخصیت اندرا گاندھی ہیں جن کا اصل نام بھی پریہ درشنی تھا۔

صبح اٹھ کر ٹی وی آن کیا تو سنسکار ٹی وی پر مراری باپو کا پروگرام لائیو دکھایا جا رہا تھا۔ وہ بہت دھیمے دوستانہ اور آسان انداز اور متبسم چہرے کے ساتھ رام کتھا کے حوالے سے روزمرہ زندگی میں انسانی رویوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے خمار بارہ بنکوی کا ایک شعر بھی پڑھا اور اسے بہت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اپنے نفس مضمون کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں بلکہ ان کی مذہبی تعلیم بھی انسان دوستی کے گرد ہی گھومتی ہے جو کم از کم میرے لیے ایک غیر متوقع اور انتہائی خوشگوار تجربہ تھا۔ یہ لطف اس لیے بھی طویل تر ہو گیا کہ ہمارے میزبان معظم علی جنہوں نے ہمیں اودھے پور کی سیر کرائی تھی اس وقت وہاں سے کسی مہمان کو لینے کے لیے ائیر پورٹ گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی کا وقت وہی تھا جب ہمیں مقامی میزبان ایس پی ناتھ دوارہ کے گھر چائے پر جانا تھا۔

مراری باپو سے راج کمار رضوی تک

ایس پی صاحب کا نام بڑا شاعرانہ قسم کا تھا لیکن اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آرہا اور اندازے سے میں ان کا نام اس لیے نہیں لکھنا چاہتا کہ اس میں فلم سٹار دلیپ کمار صاحب کی ایک نصیحت آڑے آتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کوئی پندرہ برس قبل لندن میں میری دلیپ کمار صاحب کے ساتھ ان کے فلیٹ پر ایک خاصی طویل ملاقات ہوئی جس میں دوران گفتگو یہ موضوع بھی زیر بحث آیا کہ بعض اوقات چہرے اور نام ایک ساتھ ذہن میں نہیں آتے جبکہ مخاطب یہ توقع کر رہا ہوتا ہے کہ اسے نام سے پکارا جائے۔ دلیپ صاحب نے کہا' ہاں بھئی عمر کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ تو ہوتا ہی ہے پھر مسکرا کر بولے' اکثر میں سائرہ بی بی (بیگم دلیپ کمار) کا نام بھول جاتا ہوں اور انہیں مجھے یاد دلانا پڑتا ہے کہ یہ میری نصف بہتر ہیں۔ اس پر سائرہ بانو مسکرا کر بولیں' نفسیات دان کہتے ہیں کہ آدمی صرف وہی نام بھولتا ہے جنہیں وہ یاد نہیں رکھنا چاہتا۔ میں نے کہا اس مسئلے کا ایک حل ہو سکتا ہے کہ اندازے سے جو نام ذہن میں آرہا ہو لے لیا جائے کیونکہ اکثر یہ اندازہ صحیح نکلتا ہے۔

دلیپ صاحب نے زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کبھی نہ کیجئے کیونکہ اس طرح آدمی ڈبل ایکسپوز ہو جاتا ہے یعنی غلط نام لینے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ آپ جو نام لے رہے ہیں اس کو بھی نہیں پہچانتے اور جس کا نام لے کر اسے بلا رہے ہیں اسے بھی نہیں جانتے۔''

ایس پی صاحب کے گھر کی جو بات مجھے بہت پسند آئی اور اب تک یاد ہے وہ اس کی سادگی تھی ایک عام سا سرکاری گھر' سفیدی والے کمرے' معمولی سی ٹیوب لائٹیں اور نیم خستہ سے بلب' سامان آرائش اور فرنیچر بھی انتہا کے سادہ۔۔۔۔۔۔۔ یوں سمجھئے کہ اس گھر کی سب سے قیمتی چیز میزبانوں کی مسکراہٹ اور گرم جوشی تھی جبکہ ہمارے اسی درجے کے بیشتر افسران کے گھر محلات کو بھی شرماتے ہیں۔

مہمانوں کو بھارت کے روایتی انداز میں پھول اور شالیں پیش کی گئیں اور ایک مقامی ٹی وی چینل نے ہمارے تاثرات فلم بند کئے یہاں پر مختلف شہروں سے آئے ہوئے شعراء سے بھی ملاقات ہوئی جنہیں کسی اور ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا ان میں سے معراج فیض آبادی' مخمور سعیدی' راشد ممتاز اور وسیم بریلوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سب ہی نے پاک بھارت ادبی تعلقات کے فروغ پر خوشی کا اظہار کیا البتہ ممتاز راشد نے اپنی گفتگو کے دوران سرحدوں کی تقسیم کے بارے میں ایک قابل اعتراض جملہ کہا جس پر ہم سب کی طرف سے فوری ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ میزبانوں کے معذرت آمیز رویے کی وجہ سے اس وقت تو بات دب گئی لیکن میرے

دماغ میں ایک بار پھر ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیاتی الجھنوں کا سوال تازہ ہو گیا جس کی وجہ سے انہیں بعض اوقات بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار ہونے کی یاددہانی کرانی پڑتی ہے۔

مشاعرے کا پنڈال اس قدر وسیع و عریض تھا کہ اس میں تیس چالیس ہزار تک لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے تقریباً دس ہزار سامعین جمع ہو چکے تھے اور اب صرف مراری باپو کا انتظار تھا جن کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ وقت کے بے حد پابند ہیں میرا تجربہ ہے کہ اس طرح کے عوامی نوعیت کے جلسوں میں ہمیشہ کچھ منتظمین ضرورت سے زیادہ ''منتظمین'' ہوتے ہیں اور اپنی موجودگی اور اہمیت کا احساس دلانے کے لیے عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں یہاں بھی ایک ایسے ہی صاحب موجود تھے۔ جونہی پتہ چلا کہ مراری باپو پہنچ گئے ہیں وہ صاحب سٹیج کے بائیں طرف اگلی صف میں بیٹھے ہوئے شعراء کے پاس آئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ دوسری صف میں چلے جائیں کیونکہ یہ جگہ شاعروں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کے انداز میں تحکم اور بے چینی کا ایک ایسا انوکھا امتزاج تھا کہ ہمیں مشاعرے میں کسی مزاحیہ شاعر کی عدم موجودگی کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

مراری باپو شاعروں کو شیلڈیں اور شالیں پیش کرنے کے بعد ہمارے سامنے ایک فرشی نشست پر بیٹھ گئے جو خاص طور پر ان کے لیے تیار کی گئی تھی۔ ان کے اردگرد مشاعرے کے سپانسرز ان کے خاص مہمان اور مقامی اشرافیہ کے لوگ بیٹھے تھے اور دائیں بائیں اور پیچھے خلقت کا ایک ہجوم تھا جس نے انتہائی توجہ سے مشاعرہ سنا لیکن سب سے زیادہ داد شاید مراری باپو نے ہی دی۔ اس عمر میں پانچ گھنٹے مسلسل بیٹھنا اور ہر شاعر کو اس قدر توجہ سے سننا اس بات کا شاہد تھا کہ وہ شاعری کا ذوق اور سمجھ دونوں رکھتے ہیں حالانکہ وہ اردو رسم الخط پڑھنا نہیں جانتے اور کم و بیش یہی حال مشاعرہ گاہ میں موجود ۹۹ فیصد سامعین کا تھا کہ وہاں اردو شاعری اب پڑھنے کی نہیں صرف سننے کی چیز رہ گئی ہے۔

پاکستان کے چاروں مہمان شاعروں یعنی عنبرین' سعود عثمانی مجھے اور احمد فراز کو بہت توجہ اور گرم جوشی سے سنا گیا اور خوب داد سے بھی نوازا گیا اس کی ایک وجہ شاید آداب مشاعرہ اور پاس میزبانی کے علاوہ یہ بھی تھی کہ پاکستانی شاعری کا مزاج' انداز اور موضوعات واضح طور پر بھارتی دوستوں سے مختلف اور نمایاں تھے جس کا اظہار بعد میں ہونے والی گفتگو میں مراری باپو اور دیگر ملنے والوں نے بھی کیا یہاں ہماری ملاقات غزل سنگر راج کمار رضوی اور ان کی گلوکارہ صاحبزادی سے بھی ہوئی جو پاکستانی شاعروں کا کلام بہت ذوق و شوق سے گاتے ہیں۔ راج کمار رضوی نے بتایا کہ وہ رشتے میں مہدی حسن کے کزن لگتے ہیں۔ ان کی صورت بھی کچھ مہدی حسن صاحب سے ملتی تھی لیکن ان کے نام میں شامل راج کمار اور رضوی کا تعلق یا وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی' ویسے یہ سوچنے والی

بات ہے نا۔

جے پور براستہ اجمیر

مشاعرے کے بعد سب لوگ ہوٹل گیانن میں جمع ہوئے جہاں ایک اور ویجیٹیرین کھانا ہمارا منتظر تھا' میں اگر چہ گوشت شوق سے نہیں کھاتا اور سی فوڈ کو تو ہاتھ بھی نہیں لگاتا لیکن پتہ نہیں کیوں اس کے بغیر دستر خوان کچھ عجیب عجیب سا لگا۔ کسی نے اس صورت حال پر جگر مراد آبادی کا ایک شعر پڑھا جس کے محل استعمال پر جگر مرحوم کی روح تو ضرور تڑپی ہوگی لیکن بہت سے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی ضرور ہوگئی۔

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

ایک ہنس مکھ نوجوان پولیس آفیسر اس دوران مسلسل ہمارے ساتھ ساتھ رہا اور بڑے معذرتانہ انداز میں یہ یاددہانی بھی کراتا رہا کہ ہم نے جانے سے پہلے اپنے پاسپورٹ اور ویزا کی کاپیاں اس کے دفتری ریکارڈ کے لیے ضرور مہیا کرنی ہیں ہم نے اسے بتایا بھی کہ ہمارے ویزے پولیس رپورٹ سے مستثنیٰ ہیں مگر اس کا مطالبہ اپنی جگہ قائم رہا کہ اس کے بقول اسے یہ ہدایت اوپر سے ملی تھی اور کم از کم اوپر کی ہدایت کی تعمیل کی حد تک پاکستان اور بھارت میں واقعی کوئی فرق نہیں۔

بھارت کے کچھ شعراء کو راتوں رات کسی اگلی منزل کی طرف نکل جانا تھا چنانچہ منور رانا' زبیر رضوی' ریحانہ نواب' معراج فیض آبادی اور ڈاکٹر نسیم نکہت کھانا کھاتے ہی نکل گئے۔ سعود عثمانی نے چپکے سے میرے کان میں کہا اس وقت تو ڈاکٹر نسیم نکہت ایک ہی بار جانے کی اجازت مانگ کر رخصت ہوگئی ہیں لیکن مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کے دوران انہوں نے یہ جملہ کم از کم دس بار ضرور کہا تھا۔ میں نے کہا کہ تم نے ابھی بھائی بشیر بدر اور راحت اندوری کو نہیں دیکھا یہ یہاں کی انجمن مائیک پسند شعراء اور شاعرات کے بنیادی ارکان کہلاتے ہیں یہ تو خیر ایک ہنسی مذاق کی بات تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ شعراء واقعی مائیک سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ سنا ہے پشاور کے کسی مشاعرے میں ایسے ہی ایک شاعر کی شعرخوانی کے دوران ایک خان صاحب پستول لے کر سٹیج پر چڑھ آئے تھے۔ شاعر ڈر کر بھاگنے لگا تو خان صاحب نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''خو تم شعر پھینکتے جاؤ' ام تو اس کو ڈھونڈ رہا ہے جس نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

اگلے دن صبح مرحوم احسان دانش بہت یاد آئے' ان کا ایک قول بہت مشہور تھا کہ جس شہر میں شب مشاعرہ ہو اس میں اگلی صبح نہیں

دیکھنی چاہیے کیونکہ غزل کے محبوب کی طرح مشاعرے کے منتظمین کی آنکھیں بھی راتوں رات بدل جاتی ہیں۔'' معظم علی کا وعدہ تھا کہ صبح نو بجے گاڑی ہمارے پاس پہنچ جائے گی تا کہ ہم ادھے پور میں دو گھنٹے گھوم پھر کر اجمیر کے لیے وقت پر نکل سکیں جو یہاں سے تقریباً پانچ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ خدا خدا کر کے سوا گیارہ بجے معظم علی کی صورت نظر آئی اس کے چہرے پر اس قدر جھینپی ہوئی مسکراہٹ تھی کہ ہمارے سارے گلے دل کے دل ہی میں رہ گئے سو ہم نے اسے وہ عذر گنوانے سے بھی روک دیا جس کی غالباً وہ صبح سے ریہرسل کر رہا تھا۔ گاڑی اس بار پہلے سے بھی کشادہ ملی کیونکہ اجمیر کے زائرین میں اب صرف میں' عازم کوہلی اور سعود عثمانی تھے۔
راستے کی سڑک معقول اور ڈرائیور خاصا محتاط تھا چنانچہ سفر خاصا آرام دہ رہا۔ معظم علی نے چلتے وقت درگاہ کمیٹی کے دو عہدیداروں کے موبائل نمبر ہمیں دے دیئے تھے جن کے ذمے مزار سے متعلق ہماری رہنمائی اور دیکھ بھال تھی اور ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم اجمیر کے قریب پہنچ کر صرف انہیں ایک فون کر دیں باقی کام وہ سنبھال لیں گے۔ ایک صاحب کا نام اختر اور دوسرے کا محمود تھا۔ سعود عثمانی کو سارا راستہ یہ پریشانی رہی کہ جب اس کے موبائل پر سگنل پورے آ رہے ہیں تو کال کیوں آ جا نہیں رہی۔ اس کا مصمم ارادہ تھا کہ اجمیر میں داخل ہوتے ہی جو سب سے پہلے متعلقہ موبائل کمپنی سے وابستہ دکان اسے نظر آئے گی وہاں سے اس معمے کو حل کرائے گا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر آدمی پریشان ہونے پر تل ہی جائے تو بعض اوقات اسے پریشانی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

پروفیسر پریشان خٹک (جن کا اصل نام پری شان خٹک ہے) راوی ہیں کہ کسی ایئرپورٹ پر انہیں ایک ڈرائیور نے لینے آنا تھا جو ہاتھ میں ان کی تختی اٹھائے ہوگا۔ سب مسافر اور ان کو ریسیو کرنے والے رخصت ہو گئے اور ایئرپورٹ تقریباً خالی ہو گیا مگر موعودہ ڈرائیور کہیں نظر نہ آیا۔ اس دوران میں ایک پٹھان ڈرائیور نما شخص بے چینی سے بار بار ادھر دیکھتا ہوا ان کے قریب سے گزرا۔ پریشان صاحب نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہی ان کا مطلوبہ ڈرائیور ہو' اسے روک کر کہا۔
''میں پریشان ہوں۔''
اس پر ڈرائیور جھنجلا کر بولا۔ ''صاحب میں تم سے زیادہ پریشان ہوں' میرا سواری گم ہو گیا ہے۔''

درگاہ سے خاصے فاصلے پر پارکنگ کرنے والوں نے گھیر لیا کہ گاڑی یہاں سے آگے نہیں جا سکتی اس لیے ہمیں خدمت کا موقع دو۔ بظاہر پارکنگ کے لیے کوئی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر جونہی ایک آدمی سے دو گھنٹے کے لیے ساٹھ روپے طے ہوئے اس نے ڈرائیور کو دکانوں کے درمیان ایک گلی میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ دراصل چند شکستہ مکانوں کے بیچ تھوڑی سی جگہ ہے جہاں تین چار گاڑیاں کسی پراسرار طریقے سے کھڑی ہو سکتی ہیں۔ اس عمل سے ان مکانوں کی بے پردگی تو ہوتی ہے مگر اس کی تلافی کے

لیے وہ کمیشن کافی ہے جو اس کے بدلے میں انہیں حاصل ہوتی ہے یعنی یہاں بھی بستی نظام الدین کی طرح شہر کے مکانوں کی حالت کا پہلا تعارف افسوس ناک تھا۔

سعود ایک موبائل شاپ والے سے اپنی پریشانی بیان کر رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرا نام لیا اور بتایا کہ اس نے مجھے دبئی کے کسی مشاعرے میں دیکھا اور سنا تھا اور اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ تصویریں بنانا چاہتا ہے۔ اس آدمی کے لہجے میں ایسی مسرت آمیز لجاجت تھی کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ چاروں طرف پھرتے ہوئے فقیروں نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ ہمیں کوئی بہت تگڑی آسامی سمجھے۔ سو ہوا یوں کہ درگاہ کے مرکزی دروازے تک پہنچتے پہنچتے ایک ہجوم سا اکٹھا ہو گیا۔ ابھی ہم ایک دوسرے کو جیب پاکٹ سے ہوشیار رہنے کی تاکید کر رہے تھے کہ ایک لمبا سا سفید کرتہ پاجامہ پوش جوان تیر کی طرح آیا اور اس نے ان فقیروں کو ڈانٹ کر پیچھے ہٹنے کے لیے کہتے ہوئے بتایا کہ وہ درگاہ کے خدام میں سے ہے اور ہمیں درگاہ کا وی آئی پی وزٹ کروا سکتا ہے۔ جونہی ہم نے اسے بتایا کہ ہم درگاہ کی انجمن کے مہمان ہیں اور وہاں اختر اور محمود نامی حضرات ہمارا انتظار کر رہے ہیں تو اس کے چہرے پر ناراضگی کے واضح آثار نظر آئے جیسے کسی دکاندار کے ہاتھ سے کوئی گاہک نکل گیا ہو۔

خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان میں تشریف لانے والے صوفیاء میں جو بلند مقام رکھتے ہیں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے روحانی فیوض اور برکات کے حوالے سے ہی اجمیر کو اجمیر شریف کہا جاتا ہے اور ان کے بے شمار پیروکاروں اور عقیدت مندوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی شامل ہیں لیکن اتنے بڑے بزرگ کی درگاہ کو مجاورین' خدام اور نام نہاد ورثاء نے جس طرح ایک مذہبی جنرل سٹور بنا رکھا ہے اسے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ دور دور سے آئے ہوئے ہزاروں عقیدت مند جونہی دربار کے علاقے میں داخل ہوتے ہیں یہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں بیشتر ضعیف العقیدہ لوگ ان کی لچھے دار باتوں اور شعبدہ بازیوں سے مرعوب ہو کر اپنی دلی تمناؤں کو پورا کرنے کے چکر میں اپنی جیبیں خالی اور ان کی تجوریاں بھرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ دربار کی انجمن نے باقاعدہ ایک بڑا سا کمرہ بھی بنا رکھا ہے جس کی ایک دیوار پر بہت جلی حرفوں میں نذر و نیاز درج ہے۔ انجمن کے عہدیداروں کے مطابق حاصل شدہ رقوم درگاہ کی دیکھ بھال لنگر اور دیگر انتظامات پر خرچ کی جاتی ہے لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت کہیں نظر نہ آیا۔

کم و بیش یہی حال اس مشہور دیگ کا ہے جس کے بارے میں سن رکھا ہے کہ وہاں پر لوگ ہر طرح کا پکوان ڈالتے رہتے ہیں جو تبرک کے طور پر زائرین اور غرباء میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لوگ اس دیگ میں خشک اناج' ڈرائی فروٹ' کرنسی نوٹ اور سکے ڈالتے رہتے ہیں جو درگاہ کمیٹی کی ملکیت ہوتے ہیں جو دیگ تیار کرنے سے پہلے نکال لیے جاتے ہیں اور دیگ اس

وقت تیار کی جاتی ہے جب کوئی عقیدت منداپنی کوئی مراد پوری ہونے پر یامحض عقیدت کی بنا پر اس کے لیے ایک لاکھ روپیہ ادا کرتا ہے۔اس دیگ کی پکوائی صرف انتظامیہ کا منظور شدہ ٹھیکیدار ہی کرسکتا ہے۔دیگ میں پہلے سے موجود غلہ اور خشک میوہ جات البتہ اس کے لیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

ہمارے میزبان محمود صاحب نے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے لیے ہماری رہنمائی کی' ہمارے لیے درگاہ سے مخصوص پگڑیاں اور ڈورے منگوائے اور مزار پر چڑھائے جانے والے (خشک کئے ہوئے) پھولوں کے پیکٹ ہمیں بطور تبرک دیئے اور مزار کی چادر ہمارے سروں پر رکھ کر خصوصی دعا بھی اور کروائی لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل میں اس ماحول کی وجہ سے ایک بوجھ سا پڑ گیا سو میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ جو کارروائیاں یہاں ہو رہی ہیں ان کا جو حصہ آپ کی ہدایت اور رسول کریم ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہے ان میں ہمیں شامل نہ سمجھا جائے۔

میرے دل سے آواز آئی کہ یہ عظیم صاحب مزار بھی یقیناً اس صورت حال سے خوش نہیں ہوں گے۔

جنتر منتر اور رانی جودھابائی

ہمیں خود اپنے تجسس سے ہیں گلے کیا کیا
وہ بات اس میں نہیں تھی جو اس کے نام میں تھی

لیکن کم از کم جے پور کی حد تک اس بات کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا بے شک تاریخ' بھارتی فلموں اور ٹورازم کے حوالے سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق یہ شہر بغیر دیکھے بھی کافی مانوس تھا لیکن پہلی نظر میں یہ بالکل ویسا ہی لگا جیسے اسے ہونا چاہیے تھا۔جب سے انسانوں نے شہروں میں رہنا سیکھا ہے اہل فکر و نظر کو یہ مسئلہ ہمیشہ درپیش رہا ہے کہ ان کے خوابوں اور تصورات کا شہر سنگ و خشت کی اس تعمیر سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے جس میں وہ اپنے شب و روز گزارتے ہیں فی زمانہ یہ الجھن مزید بڑھ گئی ہے اور اب پرانے شہروں کے گرد پھیلنے والے نئے شہر بڑی بڑی سڑکیں' بلند و بالا عمارتیں اور جلتے بجھتے نیون سائن بھی ایک شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔جے پور کے ساتھ بھی یہ واقعہ ہوا ہے لیکن یہاں کے لوگوں اور حکومت نے قدیم شہر کو جسے Pink City بھی کہا جاتا ہے بہت عمدگی سے محفوظ کر رکھا ہے۔غیر ملکی خصوصاً گورے سیاح یہاں بہت کثرت سے آتے ہیں اس کی مختلف وجوہات بتائی جاتی ہیں۔مثلاً یہ پنک سٹی جو اپنا منفرد کردار رکھتا ہے۔اردگرد کی پہاڑیوں پر واقع قدیم شاہی محلات جو عام مغل عمارات سے ایک الگ انداز رکھتے ہیں' شہر کا امن و امان مختلف طرح کی سہولیات وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔لیکن میرے خیال میں جو چیز قدم قدم پر مشینوں کے

محتاج مغربی معاشروں کے لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہاں کا کلچر اور مخصوص ماحول ہے۔ مثال کے طور پر یہ تجربہ کہ آپ جدید ترین ماڈل کی کسی گاڑی میں جا رہے ہوں اور کسی ذیلی سڑک سے ایک ہاتھی نکل کر آپ کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دے۔ جے پور میں ہمارا قیام نیلم ہوٹل میں تھا جس کی بکنگ ہم نے عزیزی نفاست کے ذریعے پہلے سے کرا رکھی تھی۔ اب آپ پوچھیں گے کہ یہ عزیزی نفاست کون ہے اور ہم اسے کیسے جانتے ہیں تو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہماری بھارت روانگی سے چند دن قبل جے پور سے ایک فون آیا۔ فون کرنے والے صاحب نے بتایا کہ ان کا نام نفاست ہے' انہیں اپنے عزیز معظم علی سے پتہ چلا ہے کہ ہم لوگ ان کے شہر میں آ رہے ہیں ان کے والد صاحب کی خواہش ہے کہ ہم ایک رات کا کھانا ان کی طرف کھائیں اور پھر بتایا کہ ان کے والد صاحب راجستھان اسمبلی کے سپیکر رہ چکے ہیں اور شعر و ادب سے بہت گہرا شغف رکھتے ہیں۔ ہم نے اس نوجوان سے گول مول سا وعدہ کر لیا جو معظم علی کے تائیدی اور سفارشی نوٹ اور نفاست کے پے در پے فونوں (کیا اس کی جمع ''فوانین'' ہو سکتی ہے؟) کی وجہ سے جلد ہی کمٹمنٹ کی شکل اختیار کر گیا۔ نفاست نے ہمیں جے پور شہر میں ایک مقررہ مقام پر خوش آمدید کہا اور ہم ہوٹل میں سامان رکھنے اور فریش اپ ہونے کے بعد اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جو شہر کی ایک نئی آبادی مان سرور کالونی میں واقع تھا جو اسی ہزار گھروں پر مشتمل ہے لیکن یہاں مسلمانوں کو ایک بھی مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

نفاست کے والد سید منظور احمد نے جو آج کل قانون کی پریکٹس کرتے ہیں' بتایا کہ جے پور میں سات سے آٹھ لاکھ تک مسلمان آباد ہیں جو زیادہ تر اپنے آبائی دستکاری کے پیشوں سے منسلک ہیں اور اب قدیم شہر میں بری بھلی سیاسی طاقت بھی رکھتے ہیں مگر اس کالونی میں ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں اور بوجوہ مسجد کے لیے جگہ الاٹ ہونے کے باوجود اس کی آج تک تعمیر نہیں ہو سکی۔

جب ہم نے اس بوجوہ کی تفصیل پوچھی تو ان کے باقی تینوں صاحبزادے بھی وضاحت میں شریک ہو گئے جس کا لب لباب یہی تھا کہ

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ہمیں شبہ سا تھا کہ یہاں بھی حسب معمول طعام کے بعد کلام کی فرمائش کی جائے گی لیکن معاملہ ''حالانشر من بشنو'' تک محدود رہا اور طے یہ پایا کہ ہمیں رات کے وقت شہر کا ایک راؤنڈ لگوایا جائے کہ کل ہمارے پاس وقت کم ہوگا اور مقابلہ سخت۔

اس دن جے پور میں چیمپئن ٹرافی کا سیمی فائنل بھی کھیلا جا رہا تھا جو کچھ دیر پہلے ہی ختم ہوا تھا لیکن سٹیڈیم کی روشنیاں ابھی تک جل رہی تھیں اس کے بالکل قریب ریاست کا نیا اسمبلی ہاؤس تھا جس کے تینوں داخلی دروازے جو مختلف سمتوں میں واقع تھے بالکل ایک

جیسے تھے یہ ''جنتر منتر'' کیوں کیا گیا اس کی کوئی وجہ ہمارے رہنماؤں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جے پور میں ایک قدیم رسدگاہ نما عمارت بھی پائی جاتی ہے جس کا نام ''جنتر منتر'' ہے۔ ہم شاہی محل کے پہلو میں واقع اس عمارت کے قریب سے اگلے دن بھی گزرے مگر اندر جانے کا موقع نہ مل سکا جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مقامی میزبانوں کے خیال میں اسے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

اگلی صبح نیلم ہوٹل میں ناشتے کے دوران نفاست آ گیا۔ عازم کوہلی نے ہاضمے کی خرابی کی وجہ سے ناشتے سے اجتناب کیا۔ طے پایا کہ جتنی دیر میں ہم ہوٹل کے بل وغیرہ کی ادائیگی سے فارغ ہوتے ہیں۔ نفاست کرائے کی گاڑی لے آتا ہے جو ہمیں سارا دن گھمانے پھرانے کے بعد ائیر پورٹ چھوڑ دے گی اور ساتھ ہی ساتھ عازم کے لیے مطلوبہ دوا بھی لیتا آئے گا۔ نیلم ہوٹل کا سٹاف یا تو نیا اور ناتجربہ کار تھا یا ہمارا ان سے ابلاغ نہیں ہو پارہا تھا کہ وہ ناشتے سے متعلق ہر چیز ایک ایک کر کے لا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کسی بڑے گروپ کے لیے بوفے (Buffet) ناشتہ لگایا گیا تھا جو کسی نامعلوم انتظامی مجبوری کے باعث کوئی آدھ گھنٹے بعد دوبارہ لگایا جائے گا سو یا تو ہم اس کا انتظار کریں یا پھر جو حاضر مال ملتا ہے اسی پر گزارہ کریں۔ سعود عثمانی نے کہا یہ تو اسی طرح کی بات ہوئی جیسے لاہور میں ویگنوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے۔ ''پاس کر یا برداشت کر'' طے یہ پایا کہ سب سے پہلے امبر محل چلا جائے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے اور ٹورسٹوں کے لیے سب سے زیادہ دلکشی کا حامل ہے جبکہ راستے میں آنے والے تمام بورڈوں پر اس کا نام Amber لکھا ہوا تھا۔ اس قلعہ نما محل سے کچھ فاصلے پر دو اور ایسی ہی عمارتیں تھیں جن میں سے ایک انڈین آرمی کے زیر استعمال تھی۔ معلوم ہوا کہ اس نہار گڑھ کے قلعے کے ایک حصے میں اب موجودہ راجہ بھوانی سنگھ کی سوتیلی ماں رانی گائیتری دیوی رہائش پذیر ہے جو اپنے زمانے میں دنیا کی دس خوبصورت ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھی اور اب تقریباً اسی (۸۰) برس کی عمر میں بھی ایک بہت دلکش شخصیت کی مالک ہے۔ اس کا میاں مان سنگھ۔ III پولو کا عالمی کھلاڑی تھا جو ستر کی دہائی میں ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس محل کا بیشتر حصہ عوام اور سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا ہے جس کے بدلے میں اس کی چالیس فیصد آمدنی راجہ کے اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔

جے پور کے مہاراجے تاریخی طور پر مغلوں کے دوست رہے ہیں اور رانا سانگا کے بعد اس دوستی کو مضبوط کرنے کے لیے مغلوں سے رشتہ داریاں بھی قائم ہوئیں۔ اکبر اعظم کی بیوی اور جہانگیر کی والدہ رانی جودھا بائی کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔

عینی آپا سے ملاقات

جے پور میں جس جس سے بھی بات ہوئی اس نے کسی نہ کسی حوالے سے راج مندر سینما کا ذکر ضرور کیا۔ معلوم ہوا کہ ستر کی دہائی

میں یہ سینما کسی بہت ہی شوقین اور خوش ذوق شخص نے تعمیر کرایا تھا اور اس کی خوبصورتی اور انفرادیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب وقت کی کمی کے باعث ہمارے پروگرام میں فلم دیکھنے کا ٹائم نہ نکل سکا تو میزبان یہ تجویز لے کر آئے کہ ہم صرف پندرہ منٹ اس سینما ہال میں گزار لیں تا کہ فلم کی نہ سہی ہال کی خوبیوں اور ماحول کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے۔ افسوس کہ ایسا بھی نہ ہو سکا البتہ احباب کی زبانی اتنا پتہ چل گیا کہ یہ سیٹوں کے اعتبار سے غالباً دنیا کا سب سے بڑا سینما ہال ہے کہ اس میں بیک وقت پندرہ سو ناظرین بیٹھ سکتے ہیں اور یہ کہ اس کی لابی وسعت کے اعتبار سے کئی عام پورے پورے سینما گھروں سے بڑی ہے۔

سٹی پیلس کے نوادرات میں سے دو چاندی کے مٹکے خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا مجموعی وزن ۵۷۵ کلوگرام بتایا گیا تھا اور اگر چہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں انہیں انٹری بھی دی گئی ہے مگر آخر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ البتہ یہ ضرور پتہ چل گیا کہ بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کے اسی طرح کے شوق تھے جن کی وجہ سے انہیں انگریزی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

جے پور ائیر پورٹ یہاں سے کنٹرول ہونے والی ائیر ٹریفک کے اعتبار سے چھوٹا لگا۔ ہماری فلائٹ ممبئی سے آ رہی تھی اور اسے اپنی منزل مقصود دہلی تک راستے میں جے پور اور دہلی رکنا تھا سو ہم نے ایک ٹکٹ میں دو مزے لے لیے کہ ڈومیسٹک فلائٹ کے مسافر ہوتے ہوئے انٹرنیشنل فلائٹ کا حصہ بنے۔ دہلی ائیر پورٹ پر سعود عثمانی کی خالہ زاد بہن' ان کا بیٹا اور ایک دو اور رشتے دار اس کے استقبال کے لیے موجود تھے سو ہم نے انہیں اگلے دن غالب اکیڈمی کے پروگرام میں ملاقات تک الوداع کہا اور عازم کے ساتھ پنجابی باغ کی طرف روانہ ہوئے جس کا راستہ اب مجھے یاد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

گلزار صاحب کو فون کیا تو ملازم نے بتایا کہ وہ بھوجن کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ان کا فون آ گیا اور گفتگو زلف یار کی طرح دراز تر ہوتی چلی گئی۔ اگر چہ موضوعات کئی تھے لیکن محور ہم دونوں کے مشترکہ محبوب بزرگ احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات اور اس سے متعلقہ واقعات ہی تھے۔

کچھ دیر بعد عدنان سمیع خان کا فون آ گیا جو کچھ دنوں سے میری ایک غزل ''چہرے پہ مرے زلف کو پھیلاؤ کسی دن'' پر کام کر رہا ہے۔ بنیادی طور پر غزل سنگر نہ ہونے کی وجہ سے اسے کئی مشکلات کا سامنا تھا کیونکہ وہ اس میں گیت کے رنگ کا اضافہ کرنا چاہتا ہے اور میں کمپوزیشن کو غزل کے انداز سے قریب تر رکھنے پر اصرار کرتا ہوں۔ بیچ میں کئی بار ہم کسی نتیجے پر پہنچ بھی گئے مگر عدنان سمیع خان کی طبیعت میں بڑے فنکار کی طرح جو ''بہترین'' (Perfect) کی تلاش کا شوق ہے وہ اسے چین نہیں لینے دیتا اس نے گنگنا کر مجھے

پوری غزل سنائی اور بتایا کہ اسے کس کس مقام پر کیا کیا مشکل پیش آ رہی ہے اور اس سلسلے میں جو حل اس کے ذہن میں ہیں ان سے وہ مجھے آگاہ کرنا چاہتا ہے تا کہ میری رائے اور رضا مندی سے آگے چلا جائے' میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ تمام فنون لطیفہ اپنی بنیاد میں ایک ہی ہیں چنانچہ اگر مختلف فنون کے لوگ آپس میں مکالمہ کریں تو سب سے کام میں بہتری پیدا ہو سکتی ہے۔

عازم کی بڑی بیٹی شینا اور داماد جے ونت خاص طور پر مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تھے سو کچھ دیر ان سے گپ شپ رہی۔ چھوٹی بیٹی سمرت نے بتایا کہ وہ آج کل موبائل فون بنانے والی ایک بہت بڑی کمپنی کے شوروم ڈیزائن کر رہی ہے اور یہ اس کے انٹریئر ڈیزائننگ کی تعلیم کا پہلا بڑا امتحان ہے۔ اس کے لہجے کی مضبوطی اور اپنے کام سے کمٹمنٹ دیکھ کر خیال آیا کہ یہ طرز فکر ابھی ہمارے یہاں کی ملازمت کرنے والی خواتین میں نسبتاً کم کم ہے کہ ہماری فیلڈ میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی عام طور پر اپنی ذاتی آرائش کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فکر مند رہتی ہیں۔

میں جب بھی دہلی جاؤں میری کوشش ہوتی ہے کہ جامعہ ملیہ اور دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں کچھ وقت گزاروں کہ یہاں پر موجود احباب سے تبادلہ خیال کے ذریعے پورے بھارت میں اردو زبان' اس کی صورت حال اور مسائل کے بارے میں مفصل اور بہتر معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث اس بار صرف جامعہ ملیہ ہی جانا ہو سکا کہ دن چھوٹا اور پروگرام بہت لمبا تھا۔

جامعہ سے نکل کر فون پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بیٹے ترون سے رابطہ کیا تا کہ نارنگ صاحب کے گھٹنوں کے آپریشن کی صورت حال معلوم ہو سکے اور اگر ممکن ہو تو ان کی عیادت بھی کر لی جائے۔ معلوم ہوا کہ آپریشن ہو گیا ہے مگر ڈاکٹر صاحب ابھی دو تین دن خصوصی نگہداشت کے وارڈ میں رہیں گے جہاں ان سے ملاقات تو کیا' بات بھی ممکن نہ ہو سکے گی تو گویا معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ ۷۵ برس کی عمر میں گھٹنے بھی آدمی کے خیالات کی طرح ہو جاتے ہیں جنہیں بدلنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنی دعائیں اور نیک تمنائیں ترون اور منورما بھابھی کے سپرد کیں اور سیریز والوں کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے جہاں مسٹر بھر دواج اور دید چاندنا اس کنٹریکٹ کے کاغذات تیار کیے بیٹھے تھے جن پر مجھے دستخط کرنا تھے کیونکہ بھارت میں پراپرٹی رائٹس کے بارے میں بہت سختی کی جاتی ہے۔ یہیں سے مجھے معلوم ہوا کہ پوجا بھٹ نے میرا جو گیت ''لگن لاگی من کی لگن'' اپنی فلم ''پاپ'' میں استعمال کیا ہے اس سلسلے میں اگر میں صرف ایک باقاعدہ لیگل نوٹس بھجوا دوں تو ان سے اچھے خاصے پیسے وصول کیے جا سکتے ہیں۔ بعد میں کچھ احباب کے مشورے سے طے کیا گیا کہ نوٹس دینے سے پہلے بات کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

قرۃ العین حیدر بلا شبہ اس وقت اردو کا سب سے سینئر اور معتبر نام ہیں۔ گزشتہ دو دوروں کے دوران باوجود کوشش کے ان سے

ملاقات کی صورت نہ نکل سکی کہ وہ ذاکر باغ سے نوئیڈا کے علاقے میں منتقل ہو چکی تھیں جو شہر کے مضافات میں واقع ایک نئی آبادی تھی اور جہاں آنے جانے میں خاصا وقت لگتا تھا لیکن اس روز صورت حال بہت مختلف تھی کہ ٹی سیریز والوں کا دفتر بلکہ دفاتر نوئیڈا ہی میں تھے جہاں سے عینی آپا کا گھر دس فٹ کی مسافت پر تھا۔ سوچا کہ فون پر بات کر کے پہلے وقت لے لیں لیکن واقفان حال بتا چکے تھے کہ اب وہ بہت اونچا سننے لگی ہیں اور کئی دفعہ بہت سے حوالے دینے کے باوجود پہچان نہیں پاتیں۔ سو طے یہ ہوا کہ چانس لے کر دیکھ لیتے ہیں اور فیض صاحب کے اس شعر پر عمل کرتے ہیں کہ

در کھلا پایا تو شاید اسے پھر دیکھ سکیں
بند ہو گا تو صدا دے کے چلے آئیں گے!

ان کا گھر جس کالونی میں واقع تھا وہ خاصی صاف ستھری اور پر سکون تھی لیکن غالباً سکیورٹی کے پیش نظر ایک مرکزی راستے کے علاوہ داخلے کے تمام راستے بند تھے' سو ہمیں خاصا گھوم کر جانا پڑا۔ گھر سے ملحقہ چھوٹے سے لان میں دو تین بچے کھیل رہے تھے جو غالباً اس ملازمہ کے تھے جس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا اور ہمیں ایک چھوٹے سے لابی نما کمرے میں جا بٹھایا۔ میں نے راستے میں عازم کو عینی آپا کی متلون مزاجی سے غالباً زیادہ ہی ڈرا دیا تھا کیونکہ وہ کرسی کے آخری سرے پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے موقع ملتے ہی بھاگ نکلے گا۔ میں نے دیواروں پر لگی ہوئی مختلف فریم شدہ تصویروں میں موجود کرداروں کو پہچاننے کی کوشش ابھی شروع ہی کی تھی کہ ایک سائیڈ کے کمرے سے عینی آپا سبز رنگ کے سوٹ پر ایک پتلی سی سویٹر پہنے اور چادر اوڑھے تشریف لے آئیں۔ وہی سرخی مائل رنگے ہوئے بال جو اب ان کی پہچان بن چکے تھے اور عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی زندہ اور روشن آنکھیں جن کی چمک شاہد تھی کہ بھلے ان کا جسم بوڑھا ہو گیا ہو مگر ان کا ذہن اب بھی جوان اور چاک و چوبند ہے۔ ان کی آواز میں اب بھی وہی تیزی تھی جس کا اعتماد مخاطب کو مرعوب کر دیتا ہے لیکن میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ اب نہ صرف ان کا حافظہ مائل بہ زوال ہے بلکہ ان کی گفتگو میں بھی نسیان کی وہی کیفیت در آئی ہے جس کا تعلق غالباً الزائمر نامی بیماری سے ہے جس میں آدمی بار بار ایک ہی بات کرتا ہے اور اسے قطعاً یاد نہیں رہتا کہ وہ یہی بات چند لمحے قبل بھی کر چکا ہے۔ انہوں نے مختلف افراد کے بارے میں مختلف سوالات کیے مگر صاف پتہ چل رہا تھا کہ ان کے ذہن میں بہت سی باتیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کی ایک وجہ ان کا ثقل سماعت بھی ہو لیکن سچی بات ہے اپنے کسی محبوب اور محترم شخص کو ایسے عالم میں دیکھنا ایک انتہائی تکلیف دہ تجربہ ہے۔ مجھے اس وقت رہ رہ کر شفیق الرحمن مرحوم سے چند آخری ملاقاتیں یاد آئیں' یہ وقت بھی کیسا ظالم ہے کیسے کیسے تاریخ ساز لوگ اس کے منہ زور سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح

بے بس نظر آنے لگتے ہیں۔

خلاف معمول انہوں نے بہت خوشی سے ہمارے ساتھ تصویریں بنوائیں اور میرے اس سوال کے جواب میں کہ آج کل کچھ لکھ رہی ہوں' بڑی چہکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''کیوں نہیں بھئی لکھ رہی ہوں' خوب لکھ رہی ہوں' مسلسل لکھ رہی ہوں۔'' اور پھر میری پیش کردہ کتاب ''یہیں کہیں'' اور میری نظموں کے تراجم ''Love Encompasses All'' کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا' بھئی یہ ہمارے پاکستان میں کتابیں بہت اچھی چھپنے لگی ہیں۔

واپسی

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

تو اب صورت حال یہ تھی کہ واپسی کا ہنگام آ پہنچا تھا لیکن سوچئے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پانچ دن اتنی جلدی کیسے گزر گئے۔ مادی سہولتوں نے زندگی کی رفتار اس قدر تیز کر دی ہے کہ کسی منظر پر نظر جمانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ سارا دن پہلے سے طے شدہ مصروفیتوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزر جاتا ہے اور شام غالب کا یہ شعر دہراتی ہوئی آتی ہے کہ

بے صرفہ ہی گزرتی ہے گرچہ ہو عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

اب جو گھر سے لے کر چلے ہوئے کاموں کی فہرست پر نظر ڈالی تو ہول سا اٹھنے لگا کہ اس قدر کم وقت میں یہ سارے کام کیسے نمٹیں گے۔

وقت پر زور نہیں' عمر چلی جاتی ہے
کس قدر کام پڑے ہیں ابھی کرنے والے

غالب اکیڈمی والوں نے ہم لوگوں کے اعزاز میں ایک شام کا اہتمام کیا تھا جو خود بخود ایک محفل مشاعرہ کی شکل اختیار کر گئی۔ جن میزبان شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں سے گلزار دہلوی' مخمور سعیدی' ہمایوں ظفر زیدی' ترنم ریاض' تابش سعدی' انجم عثمانی اور متین امروہوی کے نام ذہن میں رہ گئے ہیں۔ متین امروہوی کا نام یاد رہ جانے کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہم مہمانوں کے اعزاز میں جو قطعہ پڑھا وہی انہوں نے گزشتہ برس میرے لیے پڑھا تھا اور میری اطلاعات کے مطابق وہ اس ایک قطعے سے درجنوں مہمان

بھگتا چکے ہیں۔اس پر مجھے اپنے ایک مرحوم دوست شاعر بہت یاد آئے جو ایک ہی نظم چار مختلف سیاسی لیڈروں کے علاوہ کچھ مذہبی بزرگوں اور اپنے اخبار کے بانی ایڈیٹر کے بارے میں بھی پڑھا کرتے تھے۔

اس محفل کی سب سے قابل ذکر بات سینئر افسانہ نگار جوگندر پال کا صدارتی خطبہ تھا جس میں انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں پر گفتگو کی اور ''ناکامی کے حسن'' پر انتہائی خیال افروز باتیں کیں۔

بستی نظام الدین میں آکر کریم ہوٹل میں کھانا نہ کھانا برادرم ڈاکٹر تقی عابدی کے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے پیرس جا کر ایفل ٹاور کی سیر نہ کی جائے۔سو ہم نے ایک ایک لقمے پر تقی بھائی کو یاد کیا کہ وہ کس طرح پچیس برس سے دیار فرنگ میں رہنے اور اپنی ایرانی بیگم کے ہاتھ کے کم نمک مرچ والے کھانے کھانے کے باوجود کریم ہوٹل کے گھی اور مرچوں سے بھرے ہوئے کھانوں کے اس قدر مداح اور قدر دان ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ میری بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ میں شاعروں سے منسوب غائب دماغی والی کوئی بات نہ کروں مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی واردات ہو ہی جاتی ہے' میں گھر سے عازم کے لیے اپنی طرف سے وہ خاص میوزک سی ڈی لے کر چلا تھا جس میں میرے لکھے حمیرا چنا کے گائے اور وزیر افضل کے کمپوز کئے ہوئے وہ آٹھ گیت محفوظ تھے جنہیں ہمارے دوست چوہدری یونس نے بڑی محبت اور سلیقے سے ریکارڈ کروایا تھا اور جن کے ویڈیوز کے لیے گلزار حامی بھر چکے تھے مگر جب وہ سی ڈی لگائی گئی تو وہ کسی ادبی کتاب کی تعارفی تقریب کی روداد نکلی۔

سینما ہال میں بڑی سکرین پر فلم دیکھنے کا اپنا ہی مزا ہے۔بدقسمتی سے پاکستان میں فلم کے ساتھ ساتھ سینما ہال بھی شدید بحران سے گزر رہے ہیں' لاہور شہر میں اب شاید ایک دو ہی سینما ہال ایسے رہ گئے ہیں جہاں اطمینان سے بیٹھ کر فلم دیکھی اور سنی جا سکتی ہے کیونکہ جو چند سینما ہال باقی ہیں ان کی سیٹیں' ماحول' صفائی' ساؤنڈ اور ویڈیو کوالٹی ایسی ہے جسے برداشت کرنا بہت مشکل ہے اور اس پر مستزاد اور ہماری فلموں کا عمومی معیار ہے جسے ''معیار'' کہنا اپنی جگہ پر ایک سوال ہے۔گزشتہ وزٹ کے دوران میں نے ایتابھ' رانی مکھر جی اور سنجے رام لیلا بھنسالی کی فلم ''بلیک'' دیکھی تھی۔اس بار مقابلہ تین فلموں میں تھا۔میں نے بیٹی سمرت کے مشورے پر ''ڈان'' اور ''امراؤ جان ادا'' پر ''لگے رہو منا بھائی'' کو ترجیح دی اور بہت دنوں بعد کسی فلم سے اس قدر لطف اندوز ہوا۔یہ فلم سنجے دت کی مشہور فلم ''منا بھائی ایم بی بی ایس'' کا ایک طرح سے تسلسل ہے کہ اس کے مرکزی کردار اور فلم کا انداز اور مزاج بظاہر ویسا ہی ہے۔یہ اور بات ہے کہ اس بار مزاح کے پردے میں بعض سنجیدہ اور دل کو چھونے والے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔تکنیکی اعتبار سے اس میں Sublime اور Ridiculous کو ساتھ ساتھ چلایا گیا ہے اور تمسخر اور تفکر کو اس طرح یکجان کر دیا گیا ہے کہ اکثر

مقامات پر ناظر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرے۔

مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال کے بعد ہی کچھ سمجھ میں آیا کہ بھارتی فلم انڈسٹری میں اچھا برا اور درمیانہ ہر طرح کا کام کرنے والوں کے لیے مواقع میسر ہیں اور ہر برس کم از کم پانچ چھ ایسی فلمیں تیار ہوتی ہیں جنہیں کسی نہ کسی وجہ سے شاندار اور غیر معمولی کہا جا سکتا ہے اور یوں یہ انڈسٹری معیار اور مقدار دونوں حوالوں سے آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ان دنوں دہلی شہر ایک خاص خبر کے حوالے سے اخبارات اور میڈیا میں توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا کہ مقامی حکومت کی طرف سے ان تمام دکانوں کو گرانے اور بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا جو رہائشی علاقوں میں قائم تھیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ یہ سلسلہ تقسیم سے قبل سے جاری تھا اور لاکھوں لوگ ان کے ذریعے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پال رہے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ یہ دکانیں نہ صرف مقامی انتظامیہ کی اجازت سے بنی تھیں بلکہ ان سے حکومت کئی طرح کے ٹیکس بھی برسوں سے وصول کر رہی ہے جبکہ حکومت کا موقف یہ تھا کہ کوئی غلط کام صرف اس لیے صحیح اور جائز نہیں ہو سکتا کہ اسے اب تک کسی نے روکا نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ حکومت ۲۰۱۰ء کے ایشیائی کھیلوں کے لیے دہلی کو پیرس بنانے کا ارادہ کر رہی ہے اور یہ کارروائی بھی اسی کا ایک حصہ ہے قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کئی لاکھ لوگوں کو بے روزگار کرنا اور اربوں کھربوں کے کاروبار بند کرانا آسان نہیں ہوگا۔

صدام حسین کو عراقی عدالت سے پھانسی کی سزا انصاف کا تقاضا تھی یا اس کا اعلان جارج بش کو درپیش مسائل کے حل کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کے جواب کی کسی کو ضرورت نہیں تھی سوائے اس کے کہ سچائی اور حق علمبرداروں کی منافقت کا ماتم کیا جائے کہ جنہیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے اپنی آنکھ کے شہتیر پر ان کی نظر نہیں پڑتی۔

ائیر پورٹ پر ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم سے ملاقات ہوئی جو آسٹریلیا سے چیمپینز ٹرافی کے فائنل میں بری طرح سے شکست کھانے کے بعد ہماری ہی فلائٹ پر پاکستان جا رہی تھی۔ کئی لوگ ان سے بات کرنے یا آٹو گراف لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر شاید یہ تازہ بہ تازہ ہار کا اثر تھا کہ کھلاڑی بہت کم ان کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد احمد فراز اور انتظار حسین بھی پہنچ گئے۔ انگریزی کی مشہور جرنلسٹ اور فخر عالم کی والدہ عروسہ عالم کا سامان کا سامان مقررہ حد سے کافی زیادہ تھا اور ائیر پورٹ کا عملہ ان سے بحث مباحثے میں مصروف تھا۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے آپ کو ایک گروپ کی شکل دی۔ کیونکہ یہ واحد طریقہ تھا جس سے سامان کے وزن میں رعایت ہو سکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ عروسہ بی بی کو اس کے باوجود بھی کچھ اضافی رقم ادا کرنا پڑی جس سے ثابت ہوا کہ کم از کم دہلی ائیر پورٹ پر احساس جمال کا داخلہ ممنوع ہے۔

◆◆◆